Ghalib Ke Saat ...

غالب کے سات رنگ

ڈاکٹر سہیل بخاری

ادارۂ یادگارِ غالب کراچی

Scanned with CamScanner

فہرست

حرفے چند	ادارہ	۷
پہلی بات		۹
غالب کی دورنگی		۱۳
غالب کے کلام میں مضامین کی تکرار		۲۵
غالب--ایک ڈراما نگار		۳۹
غالب اور بولوں کا کھیل		۵۷
غالب کے شعروں کی اُردو		۶۸
غالب کی ایک اُلجھن		۸۷
غالب کی سوچ کا دھارا		۹۷

Scanned with CamScanner

غالبؔ کی دورنگی

عربی کی ایک کہاوت ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اور اُردو کے ایک شاعر نے بھی کہا ہے کہ نہ ہو رات تو دن کی پہچان کیا۔ پر میں سمجھتا ہوں کہ تضاد سے چیزوں کی پہچان ہی نہیں ہوتی ان کی اہمیت بھی اُجاگر ہو جاتی ہے اس لیے اُردو کے شاعروں نے اپنے شعر سجانے کے لیے اس گُر سے بھی کام لیا ہے اور اسے شعروں کا ایک اچھا گُن مانا ہے۔ مرزا غالب کے شعروں میں یہ گُن دوسروں سے بہت بڑھا ہوا ملتا ہے جس کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوگی پر مجھے تو یہاں خالی یہ بتانا ہے کہ تضاد ان کا وہ من بھاتا اور چہیتا ہتھیار ہے جسے انھوں نے اپنے شعروں میں کتنے ہی ڈھنگ سے برتا ہے۔

ان میں سے ایک ڈھنگ یہ ہے کہ وہ شعر میں دو ایسے بول لے آتے ہیں جن کے معنی ایک دوسرے سے اُلٹ ہوتے ہیں۔ ان بولوں میں اسم، صفت اور فعل بھی شامل ہیں جیسے دوست دشمن، لاگ لگاؤ، پیر جوان، پیری جوانی، ایمان کفر، دانا نادان، فائدہ زیاں، جفا وفا، تعمیر خرابی، نفی اثبات، داد سزا، لطف ستم اسموں کے جوڑے ہیں۔ کردہ ناکردہ، ظاہر پنہاں، مشکل آسان، کم زیادہ، کم بہت، اچھا بُرا، خاص عام صفات ہیں اور مرنا جینا، گم کرنا پانا، کھونا پانا، آنا جانا، جینا دم نکلنا، بننا بگڑنا فعل ہیں۔ بولوں کے ان جوڑوں میں سے جو انھوں نے اپنے شعروں میں باندھے ہیں کچھ جوڑے ایسے بھی ہیں جن سے انھیں بہت پیار ہے اور وہ انھیں جگہ جگہ لے آتے ہیں۔ ان مثالوں کے لیے کچھ شعر نیچے لکھے جاتے ہیں:

Scanned with CamScanner

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

یہ باعثِ نومیدی اربابِ ہوس ہے
غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

ہم پیشہ وہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

بے اعتدالیوں میں سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہوگئے اتنے ہی کم ہوئے

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

اوپر لکھے ہوئے شعروں میں سے پہلے تین میں اچھا اور بُرا کے بول آئے ہیں۔ چوتھے اور پانچویں شعر میں کم اور زیادہ کا جوڑا بندھا ہے اور چھٹے اور ساتویں شعر میں کم اور بہت کے بول دہرائے گئے ہیں۔

مرزا غالب عاشق اور معشوق کی حالتیں بھی بیان کرتے ہیں تو یہ دھیان رکھتے ہیں کہ دونوں کی حالت ایک دوسرے سے اُلٹی ہو اور نہیں تو اتنی الگ تو ہو جو پڑھنے سننے والے چونک جائیں اور عاشق پر ترس کھانے لگیں۔ اس کا وہ یوں انتظام کرتے ہیں کہ معشوق ہنسی خوشی سے وقت گزار رہا ہے اور عاشق رونے دھونے اور جلنے کڑھنے میں گن گن کر گھڑیاں کاٹ رہا ہے کیوں کہ

Scanned with CamScanner

ایسے حالات برابر برابر رکھ دینے ہی سے عاشق کا دکھ بہت بڑھا ہوا لگتا ہے۔ غالب اس گھڑی عاشق اور معشوق کے لیے میں اور تو یا ہم اور تم کی ضمیریں لاتے ہیں اور کبھی یاں اور واں کے ظرف مکاں بول کر عاشق اور معشوق دونوں کی حالتوں کا اندازہ کرتے ہیں۔ جیسے:

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور د دراز
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

غالب نے اس غزل میں جس کا مطلع ہے ''شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا'' یاں اور واں کا بہت کچھ مقابلہ کیا ہے۔ اس کا ایک شعر دیکھیے:

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو
یاں رواں مژگاں چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

غالبؔ نے اپنے کتنے ہی شعروں میں ''ہے'' اور ''نہیں ہے'' کہہ کر دو حقیقتوں (ہستی و نیستی یا عدم و وجود) کو آمنے سامنے لا رکھا ہے یعنی پہلے ''ہے'' کہہ کر انھوں نے کسی چیز کا ہونا مان لیا ہے اور پھر اسی سانس میں ''نہیں'' کہہ کر اس سے انکار بھی کر دیا ہے اور اس صفائی اور ہنرمندی سے انکار کیا ہے کہ دیکھتے ہی بنتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

Scanned with CamScanner

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

پہلے شعر میں انھوں نے ''ہے'' اور ''نہیں ہے'' کو کس سہولت سے برابر برابر بٹھا دیا ہے کہ سراہتے ہی بنتی ہے۔ دوسرے شعر میں ہنسی آنے اور نہ آنے کی بات بھی ایسے ہی بے جھجک کہی گئی ہے اور تیسرے شعر میں آسان نہ ہونے کو سہل ہونا اور دشوار ہونا اتنے اچھے ڈھنگ سے ثابت کیا ہے کہ ماننا ہی پڑتا ہے۔ ایسے موقعے پر غالب کبھی کبھی اس ہاں اور نہیں کے بیچ میں حرفِ استدراک (پر، لیکن) بھی لے آتے ہیں اور ان کے سہارے سے اپنی کہی ہوئی بات آپ ہی جھٹلا دیتے ہیں یا یوں کہیے کہ کہے سے پھر جاتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ شعر دیکھیے:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

رات کے وقت مئے پئے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

تضاد کا ڈھنگ غالب نے صنعت ایہام کے ساتھ بھی برتا ہے۔ وہ ایک بول کہہ کر اس کا متضاد بول لاتے ہیں جس کے کئی معنی ہوتے ہیں پڑھنے والا پہلے تو یہ سمجھتا ہے کہ دوسرا بول پہلے بول کے معنی سے اُلٹے معنی رکھتا ہے۔ پر جب کچھ سوچتا ہے تو یہ بات کھلتی ہے کہ یہاں اس بول

Scanned with CamScanner

کے وہ معنی نہیں لیے گئے جو پہلے بول کے معنی کے خلاف ہیں جیسے ان کے اس مشہور شعر میں:

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

دو بول ''اچھا'' اور ''برا'' ایسے آئے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور شعر سُنتے ہی یا پڑھتے ہی پہلا خیال یہ آتا ہے کہ دونوں کے معنی ایک دوسرے سے الٹے ہیں اور کسی بات کی اچھائی یا برائی بتا رہے ہیں پر دھیان دینے سے پتا لگتا ہے کہ اس شعر میں ''اچھا'' سے کسی اخلاقی گُن کے نہیں ''تندرست'' یا ''صحت یاب'' کے معنی لیے گئے ہیں جو ''بُرا'' کے معنی سے بہت الگ ہیں۔ یہاں ایسے ہی کچھ اور بھی شعر دیے جاتے ہیں:

کم نہیں نازشِ ہمنامی چشمِ خوباں

تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

دل مرا سوزِنہاں سے بے محابا جل گیا

آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

ان شعروں میں ''اچھا''، ''انسان'' اور ''گویا'' کے وہ معنی نہیں جو پہلی نظر میں نکالے جاسکتے ہیں۔ ان کی جگہ ان سے ''صحت یاب''، ''شریف'' اور ''مانو'' یا ''سمجھو'' کے معنی لیے گئے ہیں۔

اُوپر کی مثالوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ غالب متضاد بولوں ہی سے یہ کام لیتے ہیں۔ وہ پوری پوری بات بھی اسی طرح کرتے ہیں کہ پہلے جو کچھ کہہ جاتے ہیں آگے چل کر اس کو سچ مچ پلٹ بھی دیتے ہیں پر بات کے اس پلٹا دے سے بھی وہ آسان سے آسان شعر کو بہت اونچا اٹھا دیتے ہیں اور یہ ان کی بہت بڑی استادی ہے۔ ایسے شعر غالب کے بہت عمدہ شعروں میں گنے

Scanned with CamScanner

جاتے ہیں جیسے:

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مرگئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

آخر میں مجھے غالب کے اس ڈھنگ کا بھی ذکر کرنا چاہیے جس سے وہ اُلٹی باتوں کو ایک ثابت کرتے ہیں یا انھیں ایک دوسرے کے پاس لے آتے ہیں یا کم سے کم ان میں ناتے اور بندھن ہی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش کبھی کبھی تو اتنی سچی ہوتی کہ پڑھنے والا جی جان سے ان کے ساتھ مل جاتا ہے۔ ان کے ایسے ہی کچھ شعر نیچے لکھے جاتے ہیں:

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
شرم ایک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے رکھے ہیں جو جام و سبو میخانہ خالی ہے
وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

Scanned with CamScanner

گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

پہلے شعر میں بحر اور بیاباں کو پاس لے آئے ہیں۔ دوسرے میں محبوب کے حجاب سے ہی اس کی بے حجابی ثابت کرنا چاہی ہے تیسرے میں دوستی اور بیگانگی کو ایک بتایا ہے چوتھے میں بھرے میخانے کو خالی کہا ہے۔ پانچویں میں بُت پرست کو بھی ایمان دار ثابت کیا ہے اور چھٹے شعر میں بتوں اور کعبے میں ناتا ڈھونڈا ہے چاہے وہ دُور کا ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح اپنے ہر دعوے پر دلیل لائے ہیں۔

تضاد کے یہ سب ڈھنگ جو اوپر بیان کیے گئے مرزا غالب کے بہت سے شعروں میں ملتے ہیں جن سے انھوں نے کبھی کسی چیز کی طرف دھیان ہی دلایا ہے کبھی کوئی بات من موہنی بنادی ہے اور کبھی لوگوں کو خالی چونکانے ہی کا کام لیا ہے۔ اس سے ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب کے شعروں میں دوسرے گُنوں کے ساتھ ساتھ تضاد کو بھی خاص جگہ ملی ہے جس کا ان کی زندگی سے بھی کوئی ناتا نکل آئے تو اچنبھا نہیں ہونا چاہیے۔ کم سے کم اس گھڑی اتنا مان لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوسکتی کہ انھوں نے اپنے شعروں میں جو اس ڈھنگ کو اتنا اپنایا ہے اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی اور وہ وجہ بھی چھوٹی موٹی نہیں ہوگی۔

یہ بھی نہیں ہے کہ ایسی باتیں غالب کے قلم سے بے دھیانی میں نکل گئی ہوں کیوں کہ ان کے خطوں سے بھی ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''قبلہ و کعبہ کیا لکھوں۔ امورِ نفسانی میں اضداد کا جمع ہونا محالات عادیہ میں سے ہے۔ کیوں کر ہو سکے کہ ایک وقت خاص میں ایک امر خاص موجب انشراح کا بھی ہو اور باعث انقباض کا بھی ہو۔ یہ بات میں نے آپ کے اس خط میں پائی کہ اس کو پڑھ کر خوش بھی ہوا اور غمگین بھی ہوا۔ سبحان اللہ اکثر امور میں تم کو اپنا ہم طالع پاتا ہوں'' (خط ۳۶ عود ہندی)۔

اس خط سے لگتا ہے کہ یہ بات غالب کے دھیان میں ہی جمی ہوئی تھی جسے انھوں نے

Scanned with CamScanner

اپنی نظم اور نثر میں طرح طرح سے ظاہر کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے :

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں "شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ظلمت غلیظ، سحر نا پیدا۔ گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں دلیل صبح کی بود پر ہے بجھی ہوئی شمع اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بُجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا وہ خود ایک سبب ہے مُجملہ اسبابِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامتِ صبح مؤیدِ ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔" (خط ۱۳۶۔ عودِ ہندی)

اسی خط میں انھوں نے اپنے ایک اور شعر کا بھی مطلب لکھا ہے جس میں اضداد اکٹھے کر دیے گئے ہیں وہ یہ شعر ہے۔

متقابل ہے مقابل میرا
رُک گیا دیکھ روانی میری

اس کے بارے میں لکھتے ہیں "تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم و راحت و رنج، وجود و عدم۔ لفظ مقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست از روئے خوئے و عادت ضد ہم دگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رُک گیا"۔ یہ خط بھی ظاہر کر رہا ہے کہ مرزا کے سوچ بچار میں دو رنگی کی بہت اہمیت تھی۔

وہ اپنے فارسی شعروں کے سامنے اُردو کے شعروں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ انھوں نے فارسی کے اس قطعے میں کہا ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

راست می گویم من و از راست سرنتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است

کیوں کہ انھیں فارسی سے بہت لگاؤ تھا اور وہ اردو بولی کو اس کے آگے بہت نیچا جانتے تھے۔ پر اردو ہی کی ایک غزل میں وہ اپنے ریختے کے لیے یہ بھی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ وہ فارسی سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ سُنیے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یُوں

ان کو اپنی فارسی پر اتنا گھمنڈ تھا کہ ہندوستان کے کسی فارسی شاعر اور لغت نویس کو نہیں مانتے تھے۔ وہ ایک خط میں مرزا رحیم کو لکھتے ہیں "شاعروں میں اچھے اچھے خوشگو اور معنی مآب ہیں لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعویٰ زبان دانی کے باب ہیں۔ رہے فرہنگ لکھنے والے خدا ان کے بیچ میں نہ ڈالے۔ جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب جامع مانند پیاز ہیں توبہ تو اور لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس" (خط ۱۳۱ عود ہندی) اور اپنے لیے لکھتے ہیں "اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے۔ میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے ہرچہ از دستگہِ پارس بہ یغما بردند تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند۔ زباں دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیۂ خاص منجانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔" (خط ۱۳۱ عود ہندی)

ایک اور خط میں رام پور کے نواب کو لکھتے ہیں "بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے" (خط ۳۲/ ۷۶ مکاتیب غالب) اس بزرگ کا نام مرزا نے قاطع برہان میں ملا عبدالصمد اور

Scanned with CamScanner

اس کے آنے کا سن ۱۸۱۲ عیسوی بتایا ہے پر بعد میں انھوں نے اس سے انکار بھی کر دیا ہے جیسا کہ مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب فرماتے تھے کہ ''مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چوں کہ لوگ مجھ کو بے استاد کہتے تھے ان کا منھ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے''۔ مرزا نے اپنی عادت کے مطابق پہلے ہامی بھری ہے اور پھر انکار کر دیا پر میری سمجھ سے ان کا انکار غلط ہے جیسا کہ آگے کھل جائے گا۔

مرزا کو دساتیر کی فارسی بہت بھاتی تھی۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ۱۷/ اگست ۱۸۵۸ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روئداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظِ عربی ہے''۔ وہ اس بے میل اور ٹھیٹ فارسی کے رسیا تھے جو مسلمانوں کے ایران جیتنے سے پہلے وہاں چالو تھی۔ اس لیے جب مسلمانوں کے پہنچنے کے بعد وہاں کی فارسی میں عربی کا میل ہوا تو مرزا نے اس بات کو اچھا نہیں سمجھا۔ اپنے ایک خط میں صاحب عالم کو چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''زبان فارسی مردے کا مال ہے۔ عرب کے ہاتھ بطریق تعیما آیا ہے جس طرح چاہیں صرف کریں'' (خط ے عود ہندی)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو عربی اور فارسی کی الگ الگ آوازوں کی پہچان بھی نہیں رہی۔

مرزا علاؤالدین احمد خان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ''اس دفعِ دخلِ مقدر کا کیا کہنا ہے، فرہنگ لغاتِ دساتیر تمھارے پاس ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی نقل تم سے منگاؤں۔ تم نے دساتیر مجھ سے مانگی، اسی صحیفۂ اقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہو گے کہ اگر دساتیر نہیں تو فرہنگ کی خواہش کیوں ہے۔ حق یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے اگر اس فرہنگ کی نقل بھیج دو گے تو مجھ پر احسان کرو گے۔ دساتیر

Scanned with CamScanner

میرے پاس ہوتی تو آج اس خط کے ساتھ اس کا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب اگر دساتیر ہوتی اور میں بھیج دیتا تو البتہ بھائی صاحب کا مشکور ہوتا۔ دین و دنیا میں کیوں ماجور ہوتا۔ ارسال ابداء پر حصول اجر کیوں مرتب ہوگیا۔ بھائی وہ مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں اور تم اس مذہب کو حق جانتے ہو کہ میں جو واسطہ اس کے اعلان وشیوع کا ہوتا تو عند اللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ اور ایک شعر میرا اور ایک شعر حافظ اور ایک شعر مولوی روم کا سناؤ۔

غالبؔ:

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

حافظؔ:

جنگ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

مولانا رومؔ:

''عاشقاں را مذہب وملّت جداست''

(اُردوئے معلی ص ۳۰۱)

اب آ کر کھلا کہ مرزا کو دساتیر کی فارسی سے اتنا پیار اس لیے تھا کہ دساتیر انھیں پیاری تھی اور دساتیر سے انھیں اتنا گہرا لگاؤ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب کہ انھیں یہ کتاب کسی پارسی استاد نے پڑھائی ہو جو آپ بھی دساتیر سے پیار رکھتا ہو۔ اس لیے ان کا ملا عبدالصمد سے فارسی پڑھنا ٹھیک اور اس سے انکار کرنا غلط ہے اور اب یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان کی نظم اور نثر میں جہاں جہاں اضداد کے جوڑے آئے ہیں اور ان کی طبیعت کی دو رنگی جھلک رہی ہے وہ اسی زرتشتی تعلیم کا اثر تھا جو انھوں نے ملا عبدالصمد پارسی اور دساتیر سے پائی تھی۔ اس وقت جب کہ ان کی عمر کم

Scanned with CamScanner

تھی اور طبیعت میں اثر لینے کی صلاحیت بہت تھی زرتشت کی دوئی سے دلچسپی پیدا ہو جانا ایک فطری بات تھی۔ علاؤ الدین احمد خان کے نام لکھے ہوئے خط میں دساتیر اور اس کے ناتے سے زرتشتی دھرم سے ان کا لگاؤ صاف ظاہر ہو رہا ہے اور دل کا چور زبان پر آیا جا رہا ہے۔

--------☆☆☆--------

Scanned with CamScanner

غالبؔ کے کلام میں مضامین کی تکرار

کسی بات یا بول کا دہرانا یوں تو نثر میں بھی بُرا سمجھا جاتا ہے پر شعر کی تو یہ بہت بڑی کھوٹ مانی جاتی ہے اور حال یہ ہے کہ اُردو کا کوئی ایک شاعر بھی ایسا نہیں نکلے گا جس کے یہاں یہ عیب تھوڑا بہت نہ پایا جاتا ہو۔ اس لیے غالب کے کلام میں بھی تکرار کا ملنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے پر اچنبھا اس بات پر ضرور ہے کہ ان کے یہاں ایسے مضمونوں کی گنتی بہت بڑھی ہوئی ہے جنھیں انھوں نے بار بار دہرایا ہے۔ یہ مضمون کئی طرح کے ہیں اور انھیں دہرانے کے ڈھنگ بھی الگ الگ ہیں۔ نیچے ان کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں۔

غالب نے ایک مضمون قضا کا یہ باندھا ہے کہ کوئی چاہے یا نہ چاہے موت آتی ضرور ہے۔

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

بات کہنے کا یہ ڈھنگ سیدھا سادہ ہے جس میں موت کے آجانے کی شکایت کی ہے پر ایک اور شعر میں وہ موت کے آنے کا معشوق کے آنے سے مقابلہ کرتے ہیں کیوں کہ معشوق کا آنا قیامت یا موت کے آنے کے برابر ہی ہوتا ہے۔

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

اور معشوق سے سوال کرتے ہیں کہ میں کس کی راہ دیکھوں؟ موت کی یا تمھاری؟ کیوں کہ موت تو بے بلائے بھی آجاتی ہے اور تم بلائے سے بھی نہیں آپاتے۔ یوں دوسرے شعر میں پہلے شعر

Scanned with CamScanner

کے مضمون سے زیادہ پھیلاؤ آ گیا ہے اور محبوب اور موت کے مقابلے سے شعر میں لطف بھی پیدا ہو گیا ہے۔

ایک اور مضمون معشوق کے جھلک دکھانے کا ہے جس کی تیزی بتانے کے لیے مرزا نے کئی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ اس کے لیے دو شعر دیکھیے۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

مرزا نے پہلے شعر میں معشوق کی چھل بل کو بجلی کے ساتھ ساتھ شعلہ اور سیماب سے بھی تشبیہ دی ہے۔ پر اکٹھی تین تشبیہوں سے بھی مضمون اتنے کا اتنا ہی رہا جتنا دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ایک بجلی کی تشبیہ سے ادا ہوا ہے اور دوسرے مصرعے سے بھی اس مضمون میں وہ خوبی نہیں آ سکی جو دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے نے پیدا کر دی ہے کہ عاشق کو بات کرنے کی حسرت رہ گئی۔ اس لیے پہلا شعر دوسرے شعر کا ایک حصہ بن کر رہ گیا۔

ایک مضمون یہ ہے کہ زندگی میں غم سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے غالب نے دو شعر کہے ہیں۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

پہلے شعر میں اس بات کا دنیا کے ایک اصول کی طرح بیان کیا گیا ہے اس لیے یہ شعر ایک بے دلیل دعویٰ ہو کر رہ گیا ہے پر جب غالب اسی بات کو دوسرے شعر میں بیان کرتے ہیں تو اس دعوے پر شمع سے دلیل بھی لاتے ہیں جس سے بات پکی ہو جاتی ہے اور دکھیارے کا دل بھی مان

Scanned with CamScanner

جاتا ہے کہ جس طرح شمع صبح تک جو اس کی زندگی کی آخری گھڑی ہے جلتی رہتی ہے اسی طرح انسان بھی مرتے وقت تک طرح طرح کے دکھ جھیلتا رہتا ہے اور جب یہی اس کا مقدر ہو چکا ہے تو پھر ان سے گھبرا کر رونا پیٹنا یا ہائے واویلا مچانا بے کار ہے اور یوں غالب کا دوسرا شعر پہلے شعر سے بڑھ گیا ہے۔

غالب اپنے محبوب کی پوجا کا مضمون بھی دو شعروں میں باندھتے ہیں۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بُتِ بیداد گر کو میں

یہاں بھی پہلے شعر میں بس اسی ایک بات پر زور دیا ہے کہ میں اس بُتِ کافر کو پوجنا نہیں چھوڑوں گا۔ اسے عاشق کی ہٹ کہہ لیجیے یا اس کے پیار کی شدت کہ وہ دنیا کے طعنوں کی کوئی پروا نہیں کرتا اور محبت میں جو راستہ اس نے پکڑ لیا ہے اسے کسی طرح چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ اس شعر میں شاعر نے ایک ایسا اعلان کیا ہے جس کا سننے والے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسی لیے اسے اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہو سکتی۔ پر دوسرے شعر میں غالب نے ''خواہش'' اور ''پرستش'' کو دو الگ الگ باتیں بتا کر اپنی منطق سے سننے والے کو بھی ساتھ لے لیا ہے اور یوں یہ شعر پہلے شعر سے اچھا ہو گیا ہے۔

غالب نے ناامیدی کی آخری حد ان دو شعروں میں دکھائی ہے۔

سرگشتگی میں عالمِ امکاں سے یاس ہے
تسکین کو نوید کہ مرنے کی آس ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

Scanned with CamScanner

پہلے شعر میں انھوں نے مرنے کی آس پر زور دیا ہے۔ پر شعر میں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں بن سکی کہ قافیے میں دو بول یاس اور آس لے آئے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایسے ہی دو بول امید اور ناامیدی دوسرے شعر میں بھی آئے ہیں پر اس میں ''مرنے کی آس'' سے دکھ کی جس بہتات کا اندازہ کرایا ہے وہ دوسری طرح نہیں ہو سکتا تھا۔ غالب نے دکھ اور بولوں کے تضاد کو ایک دوسرے کے سہارے سے اُبھار کر وہ بات پیدا کر دی ہے کہ شعر سہل ممتنع کے درجے پر پہنچ گیا ہے اور اب پہلا شعر اس کے پاسنگ کے برابر بھی نہیں ٹھیرتا۔

بات سے بات پیدا کرنے کی ایک مثال اور بھی دیکھیے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں
چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہل کرم ہوئے

پہلے شعر میں ایک سیدھی سی بات سادہ سے طریقے پر کہی گئی ہے کہ اہل کرم کا تماشا دیکھنے کو ہم نے فقیروں کا بھیس بنایا ہے۔ یہ بھی غالب کے اور بہت سے شعروں کی طرح ایک حقیقت کا سپاٹ سا بیان ہے جس میں کسی کے سلجھانے کے لیے کوئی گتھی نہیں رکھی گئی اس لیے یہ مقطع بھی روکھا پھیکا سا رہ گیا پر جب یہی مضمون دوسرے شعر میں سامنے آتا ہے تو ایک چٹکلا بن جاتا ہے اور شعر ٹھیٹھ غزل کا شعر ہو جاتا ہے کہ ہم نے فقیری میں بھی دل لگی نہیں چھوڑی اور اس کا ثبوت دوسرے مصرعے میں یوں دیا ہے کہ اہلِ کرم کے در پر سوالی بن کر پہنچے۔

غالب اپنے معشوق کو بار بار آئینہ دکھاتے ہیں جس سے اُن کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معشوق کے برابر کوئی حسین نہیں ہے اس لیے اس کے مقابلے پر اس کا عکس ہی لایا جا سکتا ہے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

Scanned with CamScanner

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو
آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

ان شعروں میں شاعر نے ذرا ذرا سا بدل تو پیدا کر دیا ہے پر مضمون وہی رکھا ہے جس سے لگتا ہے کہ انھیں اس مضمون سے بہت پیار تھا۔

غالب کا ایک چہیتا مضمون ''مجبوری'' ہے جسے وہ طرح طرح سے بیان کرتے ہیں۔

ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے
نَے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

ان تینوں شعروں کا مضمون ایک ہی ہے یعنی سکون اور آرام اور اس کی وجہ اپنی وہ مجبوری بیان کی گئی ہے جو زمانے کے ہاتھوں لاحق ہوئی ہے یعنی بے پروبالی، بے خوفی اور بے سروسامانی اور یہیں آ کر تینوں شعروں کے مضمون الگ الگ لگنے لگتے ہیں کیوں کہ تینوں کی فضا ایک دوسرے سے الگ ہے پر دھیان سے دیکھیے تو یہ شعر تکرار کے نمونے ہیں کیوں کہ ان کا سبب بھی ایک ہے اور نتیجہ بھی ایک ہی ہے یعنی مجبوری میں آرام۔ پہلے شعر میں اپنی ہی کوشش نے پروبال جھاڑ کر مجبور کر دیا ہے۔ دوسرے میں آب و دانہ کے لالچ نے قید کرا دیا ہے اور تیسرے میں غفلت نے دھوکا دے کر لٹوا دیا ہے۔ یہی مضمون ذرا سا انداز بدل کر ایک اور شعر میں یوں باندھا ہے۔

Scanned with CamScanner

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشکِ آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

اب عاشق اور معشوق کے سوال جواب کا مضمون دیکھیے۔

انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

پہلے شعر میں معشوق کے سوال نہ کرنے کی وجہ "زعمِ جنوں" اور عاشق کے نہ بولنے کی وجہ "قطعِ نظر" بتائی گئی ہے پھر بھی بات منہ بند کلی کی طرح مکھم ہی رہ گئی۔ دوسرے شعر میں معشوق کی بدگمانی اور عاشق کی ناتوانی سے دونوں کی خموشی کا سبب کھولا تو بات کچھ سپاٹ سی ہوگئی پر تیسرے شعر میں معشوق اور عاشق کی خُو اور وضع کا مقابلہ کرنے سے دونوں کے آپس کے برتاؤ میں جو آن بان اُبھر آئی ہے اس نے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ شاید اسی لیے غالب کو پھر کسی اور شعر میں یہ مضمون باندھنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

عمر کی کوتاہی کا مضمون سدا سے چلا آ رہا ہے۔ اب دیکھیے کہ غالب اس پرانے مضمون کو کس طرح نیا کرتے ہیں۔

آہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

Scanned with CamScanner

سر بر ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

تینوں شعروں کا مضمون ملتا ہوا سا ہے اور تینوں میں وصل یار سے محرومی کی بات کہی گئی ہے۔ پہلے شعر میں وصل سے محرومی کا سبب یہ بتایا ہے کہ عاشق کی زندگی مختصر رہی اور ایک بودی سی بات یہ کہی ہے کہ اگر عاشق کچھ دن اور جیتا رہتا تو وصل ہو جاتا جب کہ اور جیتے رہنا آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ دوسرے شعر میں اپنی محرومی کا ذمہ دار اپنی قسمت کو بتایا ہے کہ چاہے جتنے دن جیتے وصال نہیں ہو سکتا تھا اور تیسرے شعر میں اس کا سارا بوجھ معشوق کے وعدے پر رکھ دیا ہے جس سے عاشق کی عمر کبھی جیت نہیں سکتی۔ اس لیے آخر میں اپنے ہمت ہارنے کا اعلان بھی کر دیا ہے کہ ''فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی''۔ یوں تینوں شعروں کے مضمون میں ہلکا ہلکا سا بل ملتا ہے جن میں تیسرا شعر پہلے دو شعروں سے سوچ اور بول دونوں کے گٹھاؤ میں بڑھ گیا ہے اور میرؔ کے ایک شعر کی یاد دلاتا ہے۔

تیرے ایفائے عہد تک نہ جئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

کیا جانے شعر کہتے وقت غالب کے دھیان میں میرؔ کا یہ شعر ہی گونج رہا ہو جو غالب کے تینوں شعروں پر بھاری ہے۔

ایک مضمون یہ ہے کہ عاشق کو ستانے میں آسمان اور معشوق دونوں برابر ہیں۔ اسے بھی غالب نے کئی طرح سے باندھا ہے۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُسکا آسماں کیوں ہو

Scanned with CamScanner

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

پہلے شعر میں کہا ہے کہ آسمان کو دیکھ کر معشوق یاد آجاتا ہے کیوں کہ دونوں ہی عاشق کو ستاتے ہیں۔ دوسرے شعر میں غالب نے مضمون تو اتنا ہی سیدھا سادہ رکھا جتنا پہلے میں باندھا تھا پر ''دوست اور دشمن'' کے دو متضاد بول لا کر مضمون کو چار چاند لگا دیے اور یہ شعر پہلے شعر سے نہیں اونچا اٹھ گیا ہے تیسرے شعر میں شاعر نے اس مضمون کو اور پھیلانا چاہا ہے اور کہا ہے کہ معشوق اس گھڑی یاد آتا ہے جب ہم آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور آسمان کی طرف اس وقت دیکھتے ہیں جب زمین سے نظریں ہٹا کر سر اونچا کرتے ہیں اور زمین کی طرف سر کے جھکے رہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم دنیا کے دکھ میں پھنسے ہوئے ہیں اور سرنگونی اور دنیا کے غم کا ناتا انھوں نے ایک اور شعر میں یوں باندھا ہے۔

ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

اس طرح غالب نے تیسرے شعر میں پہلے مضمون پر ایک اور مضمون جوڑنے کی کوشش کی ہے پر اس کوشش سے بات بہت بوجھل ہوگئی ہے اور سرنگونی کے آخری شعر کا سہارا لیے بنا اس کا مطلب سمجھنا کٹھن ہوگیا ہے۔

ایک پرانا مضمون یہ ہے کہ معشوق کے ہاتھ سے قتل ہونا عاشق کی خوش قسمتی ہے اس لیے جب عاشق اپنے معشوق کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھتا ہے تو اسے عید کی سی خوشی ہوتی ہے۔

عشرت قتل گہہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

اس پر غالب نے رشک کا ایک اور مضمون بڑھا دیا کہ معشوق کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر عاشق جل اٹھتا ہے اور یہ چاہنے لگتا ہے کہ مجھے بھی اپنے معشوق کے اتنے پاس ہونے کا موقع ملتا وہ

Scanned with CamScanner

کہتے ہیں۔

آتا ہے میرے قتل کو پُرجوش رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

پر سادگی کا بول غالب کا سوچ یہاں سے دوسری طرف موڑ دیتا ہے اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اب آفتاب اور شبنم کا ایک اور مضمون دیکھیے اور غالب کے سوچ کر کڑیاں گنتے چلیے۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

اس شعر میں معشوق کے جلوے کو پرتوِ خورشید سے اور آئینہ خانے کو شبنمستان سے تشبیہہ دی گئی ہے اور یہ تشبیہیں بہت حسین اور رنگین ہیں پر اب اس کے بعد غالب کا سوچ دوسری طرف نکل جاتا ہے اس لیے تشبیہیں بھی بدل جاتی ہیں اور اب وہ معشوق کو سورج اور عاشق کو شبنم سے تشبیہہ دینے لگتے ہیں۔

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشق معشوق کی ایک ہی نظر میں بھسم ہو جائے گا پر یہ شعر مطلع ہوتے ہوئے بھی پھسپھسا رہ گیا کیوں کہ اس میں مہرِ درخشاں کا مستعار لہٗ اور خار بیاباں کی توجیہہ دونوں غائب ہیں۔ یہ شاید غالب کی مجبوری تھی کہ وہ مطلع میں اتنا لمبا چوڑا مضمون نہیں سمو سکے اس

Scanned with CamScanner

لیے انھوں نے دوسرا شعر کہا۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اس شعر میں خار بیاباں کو الگ کر کے زحمتِ مہر درخشاں کی جگہ عنایت کی نظر رکھ دینے سے استعارہ پورا ہو گیا اور بندش کی چستی سے مضمون بھی بہت کچھ اٹھ گیا پر مضمون سے غالب کا جی اب بھی نہیں بھرا اس لیے انھوں نے اسے ایک اور شعر میں بھی کھپانے کی کوشش کی۔

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اور تغافل اور خاک کے بول ایک اور شعر میں یوں اکٹھے دہرائے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غالب کے سوچ کا سفر ان کے ایک اور چہیتے مضمون میں دیکھیے۔ وہ عاشق کے گھر کی ویرانی بیان کرتے ہیں اور شعر پر شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

برسات کے موسم میں گھر کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس میں جگہ جگہ گھاس اُگ آئی ہے اور اس کثرت سے اُگ آئی ہے کہ دربان کی نوکری اب خالی گھاس کھودنے پر رہ گئی ہے پر اس گھر کا نقشہ کیا ہے اور اس میں کتنی عمارت بنی ہوئی ہے اس کا حال نیچے لکھے ہوئے دو شعروں میں دیکھیے۔

Scanned with CamScanner

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں
گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

ان شعروں سے ایسا لگتا ہے کہ عاشق کے گھر میں ادھر سے اُدھر تک ایک میدان نکل آیا ہے۔ اس کے چاروں طرف بس ایک گھیر کھنچا رہ گیا ہے جس سے اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عاشق کا گھر ہے اس لیے غالب اب اس کا مقابلہ دشت سے کرنے لگتے ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اور دشت کو اس سے اچھا سمجھتے ہیں کیوں کہ وہ اس سے زیادہ پھیلاؤ رکھتا ہے اسی لیے پہلے دو شعروں میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ عاشق گھر چھوڑ کر بیابان میں نکل گیا ہے۔ غالب نے دو شعروں میں دشت کو گھر سے اچھا بتایا ہے۔ سنیے۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

یہی وجہ ہے کہ اب غالب اپنے گھر کا گھیر بھی باقی نہیں رکھنا چاہتے اور یہ چاہتے ہیں کہ گھر اور بیابان میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔ دیکھیے:

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

آخر میں غالب کے کچھ شعر ایسے بھی لکھے جاتے ہیں جن میں ایک ہی بات کبھی کچھ بول

Scanned with CamScanner

بدل کر اور کبھی انھیں بولوں میں دہرادی گئی ہے اور جو سچ مچ تکرار کی مثال میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

—☆—

مرگیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس
سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

—☆—

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا

—☆—

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
ہولیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

—☆—

Scanned with CamScanner

اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو
موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

---☆---

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

---☆---

کانٹوں کی زبان سوکھ گئی پیاس سے یارب
ایک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے
ان آبلوں کے پاؤں سے گھبرا گیا تھا دل
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

غالب کے کلام کی اس جانچ پرکھ سے پتا لگتا ہے کہ ان کے یہاں تکرار کی جو مثالیں ملتی ہیں ان میں کہیں غالب نے کسی مضمون کو پھیلا دیا ہے کہیں کچھ گھٹا دیا ہے۔ کہیں اس مضمون میں کچھ اور باریکی دکھائی ہے۔ کہیں ایک مگھم بات کھول کر رکھ دی ہے۔ کہیں دعوے پر کوئی دلیل بڑھا دی ہے۔ کبھی تشبیہ دے کر بات رنگین بنا دی ہے۔ کہیں بندش چُست کر کے شعر کو اونچا اٹھا دیا ہے۔ پر ان مثالوں کو چھوڑ کر بھی ان کے یہاں ایسے شعر ملتے ہیں جن میں وہی مضمون ایک ہی ڈھنگ سے دہرایا گیا ہے اور اس کی تین ہی وجہیں میری سمجھ میں آتی ہیں کہ غالب کو کچھ مضمونوں سے گہری دلچسپی تھی جنھیں وہ بار بار باندھنے پر مجبور تھے۔ کچھ مضمونوں کو وہ ایک ایک شعر میں نہیں سمو سکے اس

Scanned with CamScanner

لیے ایک شعر کہنے کے بعد جو پیاس رہ گئی اسے بجھانے کے لیے شعر پر شعر کہتے چلے گئے اور پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ مضمون انھوں نے محنت سے بچنے کے لیے دہرا دیے ہوں کیوں کہ نئی سرزمینوں کی کھوج جان جوکھوں کا کام ہے۔

-----☆☆☆-----

Scanned with CamScanner

غالب.....ایک ڈراما نگار

اُردو کے ڈرامے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اوران میں بھی کم ایسے ہیں جن میں ادبی چاشنی ملتی ہو کیوں کہ اردو والوں کو ڈرامے سے وہ دلچسپی کبھی نہیں ہوئی جو پچھم میں انگریزی اور پورب میں سنسکرت والوں کو رہی ہے پر ہمیں اپنے یہاں کچھ ایسے فن کار ضرور دکھائی دیتے ہیں جن میں ڈراما لکھنے کی بہت کچھ سکت پائی جاتی تھی۔ جو اردو میں ڈرامے کی ریت پکی ہوتی تو یہ لوگ بیسوں ایسے ایسے اچھے اوراونچے ڈرامے لکھتے کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ان لکھنے والوں میں سب سے پہلے میر امن کا نام آتا ہے جن کی کتاب باغ و بہار بول چال اور عمل (ایکشن) کے گنوں سے بھرپور ہے اور جو داستان ہوتے ہوئے بھی ڈرامے کا بہت کچھ مزہ دے جاتی ہے۔ان کے پیچھے آنے والوں میں ڈرامے کار چاؤ مرزا غالب کے یہاں نظر آتا ہے جن کی نظم اور نثر دونوں میں ڈراما نگاری کی چسک ملتی ہے۔لوگ جو غالب کو اتنے چاؤ اور لگن سے پڑھتے اوران سے اتنی دلچسپی رکھتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں سے باتیں ہی نہیں کرتے ان کی آنکھوں کے سامنے ڈرامے بھی پیش کرتے ہیں اورانہیں خالی سننے والا ہی نہیں تماشائی بھی سمجھتے ہیں۔

مرزا نے ایسے بہت سے سین سجائے، منظر دکھائے اور سمے باندھے ہیں کہ دیکھنے والا اپنے آس پاس کو ہی کیا اپنے آپے تک کو بھول کر ان میں کھو جاتا ہے۔ وہ علاؤالدین خان کے نام ایک خط میں آسمان کا ایک سین دکھاتے ہیں۔ ''کھلا ہوا کوٹھا، چاندنی رات، ہوا سرد تمام رات، فلک پر مریخ پیشِ نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر، ادھر چاند مغرب میں ڈوبا اُدھر مشرق سے زہرہ نکلی، صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم'' اب ایک شعر سنیے۔

Scanned with CamScanner

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بُت کدے کا در کھلا

یہ قصیدے کا نہیں غزل کا شعر ہے اور یوں لگتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے ابھی ابھی کسی اسٹیج کا پردہ اٹھا ہے۔ اسی زمین میں قصیدے کا بھی ایک شعر دیکھیے جس میں ایک اور سماں باندھا ہے۔

نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا

اسی سے ملتا جلتا غزل کا بھی ایک شعر ہے جس میں ساجن کی چٹھی آنے کا ایک منہ بولتا منظر پیش کیا ہے۔

دے کہ خط منھ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

ان شعروں کے ساتھ ساتھ کچھ اور شعر بھی سنیے۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

سعد الدین خان شفق کے نام ایک خط میں موسم کا سماں یوں باندھتے ہیں۔ ''پیر و مرشد شب رفتہ کو مینہ خوب برسا۔ ہوا میں فرطِ برودت سے گزند پیدا ہو گیا۔ اب صبح کا وقت ہے ہوا ٹھنڈی

Scanned with CamScanner

بے گزند چل رہی ہے۔ ابرِ تنک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے پر نظر نہیں آتا'' اور منشی غلام غوث بے خبر کے خط میں لکھتے ہیں'' پہر دن چڑھا ہوگا، ابر گھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے۔'' اسی مضمون کے کچھ شعر بھی سنتے چلیے۔

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں

چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگِ گل پہ آب
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

اِس قطعے میں جس کا مصرع ہے'' اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل'' ایک محفل کا پورا نقشہ کھینچا ہے جسے میں طوالت کی وجہ سے چھوڑے دیتا ہوں۔

انھوں نے جگہ جگہ اپنے گھر کے نقشے بھی کھینچے ہیں جیسے۔

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

اسی برسات میں گھر کا یہ حال بھی دیکھیے۔

گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

نہ پوچھ بے خودی عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سربسر در و دیوار

Scanned with CamScanner

منشی مہر گوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔'' جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت ۔ دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں ۔ بالا خانہ کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے سونے جاگنے جینے مرنے کا محل اگر چہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہوگئی کہیں لگن کہیں چلمچی کہیں اوگالدان رکھ دیا۔ قلمدان کتابیں اٹھا کر توشہ خانہ کی کوٹھری میں رکھ دیے۔'' ایک اور خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں۔'' میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خان کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانہ میں، فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی، خط کہاں بیٹھ کر لکھوں۔''

اب وہ منظر دیکھیے جس میں غالب آپ بھی نظر آ رہے ہیں۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ایک خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں۔'' میری جان یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ میں خط لکھ رہا ہوں۔'' انھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔'' میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں۔ آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں۔'' اسی طرح مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں۔'' آج صبح دم ہوا بند ہے۔ دھوپ تیز ہے۔ پشت بآفتاب تکیہ کے سہارے بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔'' منشی غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں۔

'' جاڑے کی شدت، مہاوٹ کا مینہ، دھوپ کا پتا نہیں، پردے چھٹے ہوئے، نشیمن تاریک۔ آج

Scanned with CamScanner

نیر اعظیم کی صورت نظر آئی۔ دھوپ میں بیٹھا ہوا ہوں خط لکھ رہا ہوں۔'' نواب سعد الدین خاں شفق کو لکھتے ہیں۔'' پیر و مرشد ۱۲ بجے تھے۔ میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آ کر خط دیا۔''

اوپر لکھے ہوئے شعروں اور خطوں میں مرزا صاحب نے موسم کے حالات، گھر کے نقشے اور اپنے آس پاس کے سین اس طرح سجا کر سامنے رکھے ہیں جیسے کوئی ڈراما لکھنے والا اسٹیج سجانے کے بارے میں ہدایات لکھتا ہے اور تھیٹر کا انتظام کرنے والا پردہ اُٹھنے سے پہلے اسٹیج ٹھیک کرتا ہے جس سے دیکھنے والے وہ حالات سمجھ جائیں جن کے بیچ میں ڈرامے کی کہانی یا اس کا کوئی ایک ایکٹ شروع ہوتا ہے۔

مرزا غالب کے یہاں دو قسم کے کردار پائے جاتے ہیں۔ ایک روایتی جو اردو غزل میں شروع سے چلے آ رہے ہیں اور دوسرے شاعروں نے بھی پیش کئے ہیں اور جو غالب کے اردو دیوان میں نظر آتے ہیں۔ جیسے عاشق، معشوق، رقیب، عاشق کے دوست، ناصح، چارہ گر، واعظ، ساقی اور دوسرے۔ دوسری قسم ان اصلی کرداروں کی ہے، جو سچ مچ گوشت پوست اور ہاڑ مانس کے انسان ہیں اور ان کے خطوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں جیسے دوست، رشتہ دار، شاگرد، سرپرست، حاکم اور دوسرے۔ ان سب کرداروں میں بھی کچھ ایسے ہیں جو چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، روتے بسورتے دکھائی دیتے ہیں اور اپنی اپنی بات چیت یا عمل سے اپنے آپ کو پہچنواتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ہمارے سامنے تو نہیں آتے پر ان کے نام مرزا کی زبان سے سننے کو مل جاتے ہیں۔ پھر ان سب کے بیچ میں غالب آپ بھی ایک کردار کی طرح کام کرتے نظر آتے ہیں اور روشنی بن کر دوسرے کرداروں کے پہچاننے میں ہمیں راستہ سُجھاتے ہیں۔

یہ سب کردار مرزا غالب نے اسی طرح پیش کئے ہیں جس طرح ڈراما نگار اپنے ڈرامے میں پیش کرتا ہے اور ان سے پیار، بیر، ڈر جیسے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ غالب

Scanned with CamScanner

نے ان کی سیرتوں کو کچھ ایسے گن بھی بخشے ہیں جو انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں اور کسی دوسری جگہ نہیں ملتے۔

بات چیت ڈرامے کی خاص چیز ہوتی ہے اور غالب نے اس کے وہ موڑ پیچ دکھائے ہیں کہ پورے اردو ادب میں کوئی ان سے لگا نہیں کھاتا۔ غالب کے ماننے والے کہتے ہیں کہ وہ اپنے خطوں میں بات چیت کرتے ہیں اور یہ بات ٹھیک ہے۔ وہ اپنے خط میں حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں۔ ''مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔'' ایک خط میں نواب رام پور کو لکھا ہے۔ ''یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے'' اور میر مہدی کو بھی لکھتے ہیں۔ ''یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ یہ باتیں کرلیں۔'' غالب آپ یہ بات جانتے تھے اور اپنے خطوں کی یہ خصوصیت پہچانتے تھے اس لیے ان کے شعروں میں بھی خط کا ذکر بار بار آیا ہے جیسے۔

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوا دے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کو اپنے خط بہت پیارے لگتے تھے کیوں کہ وہ ان میں باتیں کرتے تھے پر کان دھر کر سنیے تو وہ شعروں میں بھی باتیں کرتے سنائی دیتے ہیں جیسا کہ آگے مثالوں سے ظاہر ہوگا۔

Scanned with CamScanner

مرزا نے بات چیت کے بھی ڈھنگ برتے ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے خطوں میں القاب وآداب نہیں لکھتے اور بات شروع کر دیتے ہیں کیوں کہ بات چیت کرتے وقت کوئی القاب وآداب نہیں بولتا۔ وہ نواب سعد الدین خان شفق کو بھی لکھتے ہیں۔'' پیر ومرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے۔باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب وآداب نہیں لکھتا۔''اس کے ثبوت میں ان کے کچھ خطوں کی ابتدا دیکھیے۔

۱۔کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں (نواب سعد الدین خاں شفق کے نام)۔

۲۔مارڈالا یار تیری جواب طلبی نے (میر مہدی مجروح کے نام)

۳۔کوئی ہے۔ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔لو صاحب وہ آئے۔میاں میں نے کل تم کو خط بھیجا ہے مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے (یوسف مرزا کے نام)

اور کبھی جو مرزا خط شروع کرتے وقت کوئی ایسے بول لاتے بھی ہیں جنھیں القاب کی جگہ سمجھا جائے تو یہ دھیان رکھتے ہیں کہ وہ بول بات چیت میں بھی بولے جاتے ہوں جیسے میاں۔ بھائی اور دوسرے۔

پھر مرزا بیچ بیچ میں ایسے بول بھی لکھتے ہیں جو ہماری روز کی بات چیت میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کی گنتی بہت ہے جیسے آخر، بھلا، کچھ، ایک، کوئی، کہیں، سہی، نہ سہی، ہاں، کچھ اک، لو، وہ (منظر کے لیے) اور (جیسے میں کہاں اور یہ وبال کہاں)، اَے، اَے نہیں، اک ذرا، ظاہراً، بلا سے، کیا خوب، تکلف برطرف، میں ضامن، میرا ذمہ، تا کجا، کہاں کے، خدا کو مان، خدا شرمائے، آگ لگے، اندھیر ہے، قیامت ہے، جاؤ، مت پوچھ، کچھ نہ پوچھ، نہ کہہ، نہ پوچھ، کیا کریں، کیا کروں، کیا کہوں، مت کہہ، نہ جانوں، تو جانوں، دیکھوں، دیکھنا، دیکھے، ہمارا پوچھنا کیا، کوئی بتلاؤ، ہم نے مانا، کیوں نہ ہو، آؤ نہ، گزری نہ، ہے یوں کہ کیا قیامت ہے اور دوسرے۔ یہ بول ان کے شعروں اور خطوں میں کثرت سے ملتے ہیں۔ان کی مثالوں کے لیے تھوڑے سے شعر ہی بہت ہوں گے۔

Scanned with CamScanner

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو یہ کیا ہے اے نہیں ہے

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ان کے علاوہ مرزا بول چال کے ایسے فقرے اور جملے بھی بہت لکھتے ہیں جن سے یہ سمجھا جاسکے کہ دو آدمیوں میں بات چیت ہو رہی ہے کچھ شعر دیکھیے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منھ میں زبان ہے

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

یہی حال خطوں میں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں، ''اہاہا میرا پیارا میر مہدی آیا، آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے، بیٹھو یہ رام پور ہے، دارالسرور ہے۔'' انھیں کے ایک اور خط میں لکھتے ہیں، ''لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔'' مرزا تفتہ کو لکھتے

Scanned with CamScanner

ہیں، ''لو بھائی کھچڑی کھائی دن بہلائے کپڑے پھاڑے گھر کو آئے''۔ حکیم ظہیر الدین احمد خاں سے کہتے ہیں ''اچھا میرا بیٹا، یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو۔ دیر نہ کیجیو۔

بات چیت کرنے کے لیے ہم ایک دوسرے کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور کسی خاص بات پر زور دینے اور دوسرے کو دھیان دلانے کے لیے بھی مخاطب کرتے رہتے ہیں۔ یہ ڈھنگ ہم کو مرزا کے شعروں اور خطوں دونوں میں ملتا ہے اس کے لیے غالب کبھی مخاطب کا نام ہی لے دیتے ہیں۔ انھوں نے شعروں میں بہت سوں کے نام لیے ہیں جیسے بے وفا، غافل، ظالم، جان، ہمدم، میری جان، قبلہ حاجات، زاہد، ہجوم ناامیدی، دل ناداں، فلک، واعظ۔ میر مہدی کے نام ایک خط یوں شروع کرتے ہیں۔ ''کیوں یار کیا کہتے ہو ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں'' یا انھیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں، ''میاں لڑکے کہاں پھر رہے ہو۔ ادھر آؤ۔ خبریں سنو۔'' ایک تیسرے خط میں لکھتے ہیں، ''میری جان سنو داستان صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس بہادر نے مجھ کو بلایا'' یا مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں، ''کیوں صاحب اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی'' یا یوسف مرزا کو لکھتے ہیں ''آؤ صاحب میرے پاس بیٹھ جاؤ، آج یکشنبہ کا دن ہے، ساتویں تاریخ رمضان کی اور انیسویں اپریل کی۔''

کبھی غالب ''اے''، ''ارے''، ''او''، اور فارسی ''یا'' کے بول کام میں لاتے ہیں۔ شعروں کے کچھ ندائیہ فقرے یہ ہیں۔ یارب، یاالٰہی، خدایا، بارخدایا، اے جلوۂ بخیش، اے دل، اے غارت گر جنس وفا، اے عافیت، اے انتظام، اے تراغمزہ یک قلم انگیز، اے ترا ظلم سربسر انداز، اے ذوق اسیری، اے شعلے، اے اختیار، اے ناتمامی نفس شعلہ بار، اے خدا، اے محوِ آئینہ داری، اے عمر، اے گریہ، اے ذوقِ خرابی، اے ستم ایجاد، اے مرغ، اے اہلِ جہاں، اے سنگدل، اے خانماں خراب، اے شوقِ منفعل، اے عندلیب، اے آگہی، اے ندیم، اے شرار جستہ، اے بے دماغ، اے مرگِ ناگہاں، اے نالہ، اے پرتوِ خورشید جہاں تاب، اے فلک، اے ہمدم، اے ناامیدی، اے طرہ ہائے خم بخم، اے شوق، اے تازہ واردان، اے ہوا،

Scanned with CamScanner

اے خضر، اے ساکنانِ کوچہ دلدار، اے چارہ گر، اے لئیم، اے دلِ وابستہ، اے مرگ، اے جذبہ دل، اے غیرت ماہ۔ خط میں بھی غالب میر مہدی کو یوں پکارتے ہیں، ''او میاں سید زادہ، آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھیٹ ہوئے اردو بازار کے رہنے والے۔ حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے،'' انھیں کو ایک اور خط میں یوں ٹوکتے ہیں، ''ارے بندۂ خدا۔ اردو بازار نہ رہا اردو کہاں۔'' ایک خط میں یوں کہنے لگتے ہیں، ''ارے میاں تم نے اور کچھ بھی سنا، کل یوسف مرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔'' ایک خط میں میرن صاحب کو یوں مخاطب کرتے ہیں، ''اے جناب میرن صاحب۔ السلام علیکم''۔

مرزا غالب دوسروں کی پوری پوری بات چیت بھی جوں کی توں دہرا دیتے ہیں۔ ان کے شعروں اور خطوں میں اس کی ان گنت مثالیں ملتی ہیں کہ فلاں نے یوں کہا، میں نے یوں کہا اور اس نے یوں کہا۔ یہاں میں اس کی تھوڑی سی مثالیں لکھتا ہوں۔ پہلے کچھ شعر سنیے۔

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا''

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ''ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا''
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
''جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر''
میں جو کہتا ہوں کہ ''ہم لیں گے قیامت میں تمھیں''
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ''ہم حور نہیں''
کہا تم نے کہ ''کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی''
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ''ہاں کیوں ہو''

Scanned with CamScanner

مرزا علاؤالدین خان کے نام ایک خط میں ایک بات چیت یوں دہراتے ہیں۔ ''میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اس کو چاہتے تھے۔ ہنسنے لگے۔'' میر مہدی کے نام ایک خط میں اپنی اور کمشنر دہلی کی بات چیت یوں لکھتے ہیں۔ ''ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو۔ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدۂ ولایت لے گیا تھا۔ وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے۔ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک مکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو میں نے عرض کیا کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ بھی گزارش کیا۔'' چودھری عبدالغفور کے نام ایک خط میں اپنی اور صاحب عالم کی بات چیت لکھتے ہیں۔'' پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا۔ فرماتے ہیں کہ غالب تو اچھا ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ الحمدللہ حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے۔ ارشاد ہوا کہ مولوی سید برکات حسن تیری تعریف بہت کرتے رہتے ہیں۔'' میر مہدی کو ایک خط میں اپنی کمشنر دہلی کی بات چیت لکھتے ہیں ''اور ہاں صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپیہ خزانے سے منگوالو۔ میں نے کہا صاحب یہ کیسی بات کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ دلواتے ہو۔ فرمایا کہ تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا۔ اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا''۔

کبھی کبھی غالب پوری بات چیت لکھ دیتے ہیں اور یہ نہیں بتاتے کہ یہ بات کس نے کہی ہے یعنی وہ بولنے والوں کے نام نہیں لیتے۔ نہ یہ کہتے ہیں کہ فلاں نے یہ کہا اور میں نے یہ کہا پر تھوڑا سا دھیان دینے سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ کس کی بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہوئی اور کس نے کون سی بات کی ہے۔ اس کی مثال میں کچھ شعر سنیے۔

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ ''خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا''

Scanned with CamScanner

تجاہل پیشگی سے مدّعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز ''کیا کیا''
دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے'' یہ خوش رہا''
یاں آپڑی یہ شرم کہ '' تکرار کیا کریں''
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

یہاں پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں معشوق کی بات دہرائی گئی ہے۔ دوسرے میں ''کیا کیا'' بھی معشوق کے ہی بول ہیں۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ''یہ خوش رہا'' کا مطلب ہے ''میں خوش رہا'' اور یہ معشوق حقیقی نے سمجھا تھا۔ اس کے دوسرے مصرعے میں ''تکرار کیا کریں'' سے کہنے والے نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ چوتھے شعر کے پہلے مصرعے میں عاشق اپنے بارے میں معشوق کا خیال ظاہر کرتا ہے اور پانچویں شعر میں وہ بول دہرائے گئے ہیں جو کسی جھوٹے عاشق نے معشوق کے لیے کہے تھے کہ وہ خدا پرست نہیں ہے اور بے وفا ہے۔

مرزا علاؤ الدین خان کے نام غالب ایک خط میں لکھتے ہیں، ''میرا نظر سر راہ ہے، وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی بیگ ادھر سے نکلا، بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں۔ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی۔ آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے''۔ ایک خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں ؛'' اے جناب میرن صاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب اجازت ہے مہدی کے خط کا جواب لکھنے کو۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن

Scanned with CamScanner

صاحب، اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔ سبحان اللہ اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھتا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ۔ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا، لاحول ولاقوۃ"۔ ایک اور خط میں میر مہدی کو لکھا ہے۔ "دو گھڑی کے بعد وہ آئے۔ اِدھر کی بات اُدھر کی بات۔ کوئی انگریزی کاغذ دکھایا، کوئی خط فارسی پڑھوایا۔ اجی کیوں حضرت، آپ میرن صاحب کو کیوں نہیں بلاتے، صاحب میں تو ان کو لکھ چکا ہوں کہ تم چلے آؤ اور ایک مقام کا ان کو پتا لکھا ہے کہ وہاں ٹھہر کر مجھ کو اطلاع کرو۔ میں شہر میں بلا لوں گا، صاحب اب وہ ضرور آئیں گے۔"

غالب نے جگہ جگہ خود کلامی سے بھی کام لیا ہے اور خود کلامی بھی ڈرامے کا ایک حصہ ہے۔ اس کے لیے خاص طور سے ان کی غزلوں کے مقطعے دیکھنے چاہییں جن میں غالب اپنے آپ سے باتیں کرتے سنائی دیتے ہیں جیسے۔

نہ لڑنا صبح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

Scanned with CamScanner

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ان کے علاوہ بہت سے شعر بھی خودکلامی کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن میں غالب نے اپنا نام پکارے بغیر بھی آپ سے ہولے ہولے باتیں کی ہیں اور جو کوئی بھی انہیں ہولے ہولے پڑھے گا اسے بھی ایسا لگے گا جیسے وہ اپنے ہی جی سے باتیں کر رہا ہے جیسے۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائے گا
درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی · خامہ خونچکاں اپنا
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

خودکلامی کی مثالیں غالب کے کچھ خطوں میں بھی ملتی ہیں جب کہ وہ اپنا سوچ لگاتار بیان کرتے چلے جاتے ہیں جیسے منشی غلام غوث بے خبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''کم وبیش ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ ایک امر جدید مقتضی اس کا ہوا کہ آپ کو اس کی اطلاع دوں۔ خانہ کا حلی خراب، آج لکھوں، کل لکھوں۔ اب کون لکھے، کل صبح کو لکھوں گا۔ صبح ہوئی، غالب اس وقت نہ لکھ سہ پہر کو لکھیو''۔ میر مہدی کو لکھتے ہیں، ''پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے۔ مجھ کو کیا پیام ہے، کچھ نہیں، شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ اُدھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب

Scanned with CamScanner

سرنامہ میرے نام کا آغاز تحریر میں القاب میرا پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا یہ کیا سیر ہے۔ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں۔ میری بلا لکھے"۔ ایک خط میں صاحب عالم کو لکھا ہے۔

"دن کے سونے کی عادت نہیں۔ جی میں کہا آؤ بیکار کیوں رہو۔ خط کا جواب آج لکھ رکھو۔ اٹھے کون، بکس کھولے کون۔ لڑکوں کی دوات قلم مونڈھے پر پلنگ کے پاس رکھ لی۔" کبھی کبھی مرزا اپنے آپ کو مخاطب بھی کر لیتے ہیں جیسے وہ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں،" سنو غالب رونا پیٹنا کیا کچھ اختلاط کی باتیں کرو" یا سعدالدین خان شفق کو ایک خط میں لکھا ہے،" سن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں۔ بہت مصاحب نہ بن۔ ایاز قدر خود بشناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس بعد رات کو دونوں بیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے۔ پہلے القاب لکھ پھر بندگی عرض کر پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خیر پوچھ۔ پھر عنایت نامے کے آنے کا شکر ادا کر اور یہ کہہ کہ جو میں تصور کر رہا تھا وہ ہوا۔"

بات چیت میں آواز اور لہجے کو بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ مرزا پورا جتن اس بات کا کرتے ہیں کہ بولنے والے کے لہجے اور آواز کو بھی جکڑ لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے شعروں کا مطلب سمجھنے کے لیے انہیں خاص لہجے اور آواز سے پڑھنا پڑتا ہے۔ ایسے کچھ شعر نیچے لکھے جاتے ہیں۔

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

تمھیں نہیں ہے سررشتہ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

Scanned with CamScanner

ہے ہے خدانخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

اوپر کے پہلے اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرعوں کو ایک خاص لہجے سے پڑھا جائے تو سوال بن جاتا ہے اور اسی سے ان کا مطلب نکلتا ہے۔ تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ لہجوں میں پڑھنے سے مطلب صاف ہوتا ہے۔ چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''ہاں اور'' کا لہجہ سب سے ہی الگ ہے جو ذبح کرتے میں گلے پر چھری پھیرنے کی حرکت سے میل کھاتا ہے اور پانچویں شعر کا لہجہ اور آواز کا اتار چڑھاؤ اس وقت سے ملتا ہے جب کسی کو غلط سوچنے پر ٹوکا جاتا ہے۔

ڈرامے کا ایک اور لچھن اداکاروں کا ایکشن (عمل) ہے۔ مرزا کی چٹھیوں اور شعروں میں اس کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ میر مہدی کو ایک چٹھی میں لکھتے ہیں۔ ''اس وقت پہلے تو آندھی چلی۔ پھر مینہ آیا۔ اب مینہ برس رہا ہے میں خط لکھ چکا ہوں۔ سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔'' لگاتار عمل کا یہ بیان بیتے ہوئے زمانے سے چل کر حال میں ہوتا ہوا مستقبل میں جا کر رکتا ہے جس میں سماں اور ایکشن دونوں ملے جلے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک اور ملا جلا بیان میر مہدی کے نام ایک دوسری چٹھی میں ملتا ہے۔ ''دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خان اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر بند کر کر آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے۔ اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منھ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا۔ کیا صحبت ہوگی۔'' پر چودھری عبدالغفور کے نام جو ایک چٹھی لکھی ہے اس میں خالی ایکشن ہی ایکشن ملتا ہے۔ دیکھیے ''پلنگ پر سے کھسل پڑا۔ ہاتھ منھ دھو کر کھانا کھایا پھر ہاتھ دھوئے، کلی کی، پلنگ پر جا پڑا، پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا اور پڑ رہا۔''

Scanned with CamScanner

یہی حال غالب کے شعروں کا ہے کہ ایکشن سے بھرے پڑے ہیں جیسے۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

بجلی اک کوندگئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہوگئیں

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اوپر لکھا ہوا پہلا شعر ہاتھ میں کوئی چیز اونچی اٹھا کر چھوڑ دینے کا عمل دکھاتا ہے۔ دوسرے میں محبوب کے جھلک دکھانے کا اتنا تیز عمل ہے کہ اس سے بڑھ کر تیزی سوچی بھی نہیں جاسکتی۔ تیسرے میں اچانک انگلی اٹھا کر آنے والے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور چوتھے میں بخیہ کرنے کا عمل ہے جس میں سوئی کپڑے کے اوپر نیچے آتی جاتی دکھائی دے رہی ہے۔ پانچویں شعر میں جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھا کر آسمان دیکھنے کا عمل ملتا ہے اور یوں ایک پوری کمان بن جاتی ہے جس میں عاشق کا سوچ دنیا کے دکھوں سے محبوب کے ظلم تک کا سفر کرتا ہے اور چھٹے میں وہ سب حرکتیں سامنے آجاتی ہیں جو سماج کا مجرم کسی کوٹھی کے چوکیدار کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے گھبراہٹ میں کر بیٹھتا ہے۔ یہ شعر الگ الگ

Scanned with CamScanner

غزلوں سے لیے گئے ہیں پر غالب کی ایک پوری کی پوری غزل جس کی ردیف ''کہ یوں'' ہے عمل سے بھر پور ہے۔ اس کا ایک شعر دیکھیے جس میں یہ دونوں لچھن یعنی بات چیت اور عمل ملے جلے پائے جاتے ہیں۔

''غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

اس شعر میں عاشق کا معشوق سے سوال کرنا۔ پھر معشوق کا سامنے آن بیٹھنا اور ''یوں'' یعنی ایک خاص ڈھنگ سے بیٹھنا بیان کیا گیا ہے اور عاشق یہ پورا عمل ساتھ ساتھ بول کر بتاتا بھی جا رہا ہے۔

یہ سب کی سب مثالیں جو میں نے غالب کے خطوں اور شعروں سے پیش کی ہیں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ مرزا غالب نے ڈرامے اور ڈرامے کے اصول پڑھے ہوں یا نہ پڑھے ہوں وہ ڈرامے کے فن کو برتنا ضرور جانتے تھے۔ پس منظر، کردار، بات چیت، لہجہ، خود کلامی اور عمل جو ڈرامے کے بڑے حصے ہوتے ہیں انھوں نے اپنی نظم اور نثر میں اسی استادی سے کھپائے ہیں جس طرح کوئی ڈراما نگار لکھتا ہے اور ان میں وہی اصول برتے ہیں جنھیں سامنے رکھ کر اردو ڈرامے لکھے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرزا نے کوئی پورا ڈراما نہیں لکھا جو اردو ڈرامے کی تاریخ میں ان کا بھی نام اور مقام پیدا کرتا پر ان کے شعروں اور خطوں میں بکھرے ہوئے ان ڈرامائی حصوں کو دیکھ کر ان کی ڈراما نگاری کی اہلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

Scanned with CamScanner

غالب اور بولوں کا کھیل

ہر شعر کے دو سرے ہوتے ہیں۔ایک بھیتری دوسرا باہری۔ بھیتری سرا اس کے معنی کو چھوتا ہے اور باہری سرا ان بولوں سے بندھا ہوتا ہے جو وزن اور قافیے اور ردیف کی پابندیاں پوری کرتے ہیں اور پھر ان دونوں حصّوں کی مناسب بٹھان سے ہی شعر میں وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے جو سننے والے کے منہ سے ایک دم واہ نکلوا دیتا ہے۔ غالب کے یہاں ایسے شعروں کی بہتات ملتی ہے جن میں بول اور ان کے معنی ایک دوسرے سے یوں چپک گئے ہیں کہ انھیں الگ کرنا کٹھن ہے پر ہمیں ان کے یہاں کچھ ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں جن میں یہ گٹھاؤ بودا رہ گیا ہے اور اب وہ بولوں کے کھلونے لگتے ہیں۔ان پر دھیان جمانے سے پتا لگتا ہے کہ غالب نے بہت سے شعروں میں خالی بولوں سے بھی مضمون نکالا ہے اس لیے یہ شعر پھنسے رہ گئے ہیں اور اب ہم انھیں بس اس لیے سن پڑھ لیتے ہیں کہ یہ بھی ایک بڑے شاعر کے شعر ہیں۔

غالب کے یہاں اس کی جو صورتیں ملتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ پورے شعر کا تانا بانا خالی ایک بول سے بھی بن لیتے ہیں جیسے۔

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

اس شعر کا ڈھانچہ "دست بدست" کے بول پر کھڑا ہے اور اسی کے سہارے پر جامِ مے اور خاتمِ جمشید کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ غالب نے اپنی سمجھ سے تو پورا جتن کیا ہے کہ شعر معنی کے حساب سے بھی اونچا ہو جائے پر صاف دکھائی دے رہا ہے کہ شعر کا جنم ایک بول سے ہوا ہے اس لیے اس کا بھیتری پلّا باہری پلّے سے دب گیا ہے۔اسی طرح غالب کا ایک اور شعر ہے۔

Scanned with CamScanner

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

اس میں غالب نے پردے کے بول سے مضمون نکالنا چاہا ہے اور یوں یہ شعر بھی ''پردے'' کا کھیل بن گیا ہے۔ ایک اور شعر میں انھوں نے فارسی اردو کے ملے ہوئے بولوں سے معنی پیدا کر کے شعر گھڑنے کی کوشش کی ہے۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

فارسی میں نالہ فریاد کو اور بھاشا کی بول چال میں کمر بند (ناڑا) کو کہتے ہیں۔ رسا فارسی میں پہنچنے والے کو اور بھاشا میں رسی کے مذکر رسّے کو کہتے ہیں جو کہیں کہیں تشدید کے بغیر ''رسا'' بھی سنا جا سکتا ہے۔ غالب نے اس شعر میں ان کے بولوں کے دیسی معنی دھیان میں رکھ کر فارسی معنی کی غلطی دکھائی ہے اور اپنی شوخی سے ایک شعر تیار کر دیا ہے۔

کہتے ہیں کہ غزل کے شاعر قافیے کی مدد سے شعر کہتے ہیں۔ وہ پہلے قافیے لکھ کر سامنے رکھ لیتے ہیں اور پھر ایک ایک قافیہ لے کر اس سے میل کھاتا ہوا مضمون سوچ کر شعر کہنے لگتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ شاعر کا زیادہ آسان قافیوں میں اچھے شعر کہنا بہت کٹھن ہے اور زیادہ کٹھن قافیوں میں بھی اس کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے۔ ایسی زمین جس میں سجتے ہوئے قافیوں کی اچھی خاصی گنتی ہاتھ آ جاتی ہے اچھے شعر نکالنے کے لیے ٹھیک سمجھی جاتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی ایسے بہت سے شعر مل جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قافیے سے مضمون نکالا ہے یا کسی قافیے ہی کو کھپانے کے لیے شعر کہا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں نیچے لکھی جاتی ہیں۔

ایک بار غالب کو ایک زمین میں یاد، شاد جیسے قافیے باندھنے تھے۔ سو انھوں نے باندھے اور خوب باندھے پر ایسے عام بولوں کے ساتھ ساتھ ایک بول ''خیر باد'' بھی ان کے دھیان پر چڑھ گیا جسے نراس کرنا انھوں نے گناہ جانا اور آخر سوچ ساچ کر یہ شعر گھڑا۔

Scanned with CamScanner

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

اب اس شعر پر دھیان دیجیے جس میں قافیہ باندھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ الگ ہوتے وقت خیر باد کہتے ہیں تو ملتے وقت خوش آمدید کہنا چاہیے پر یہ بہت بڑا فقرہ ہے جس کی وجہ سے پہلے مصرعے میں دوسرے بولوں کی سمائی کٹھن ہوئی جاتی تھی اس لیے اس کی جگہ مرحبا کا بول لے لیا گیا۔ دوسرے مصرعے کے ''جو جاؤں'' میں تنافر کا وہ عیب بھی آ گیا ہے جس کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی شاعر نے یہ مطلع کہہ کر استاد کے سامنے رکھا۔

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

جس کے ''جو جل'' سے بھی وہی ''جُج'' کی آواز نکل رہی ہے جو غالب کے ''جو جاؤں'' سے اُبھرتی ہے۔ اُستاد نے ذرا سے ہیر پھیر سے اس کی کھوٹ یوں دور کر دی۔

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

پھر غالب کے اس شعر میں ''کہیں'' کے بعد ''کو'' کا بول بھی بھرتی کا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پورا شعر ایک حقیقت کا سپاٹ سا بیان ہو کر رہ گیا ہے جسے تک بندی سے زیادہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

غالب کی ایک اور غزل ہے جس کا مطلع ہے ''تپش سے میری وقف کشمکش ہر تار بستر ہے''۔ اس میں غالب نے تار، بار اور خار کے قافیے باندھے ہیں پر انھوں نے قافیوں کی جو فہرست بنائی تھی اس میں ''برخوردار'' کا بول بھی تھا جسے باندھنا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا کیوں کہ بستر کا برخوردار باندھنا کسی ایسے ویسے کا کام نہیں تھا۔ یہ اپنی استادی دکھانے اور اپنا لوہا منوانے کا موقع تھا اور اس موقعے کو وہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے تھے اس لیے اس سے مضمون سوچ کر انھوں نے یہ

Scanned with CamScanner

شعر کہا۔

سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دلِ بے دست وپا افتادہ برخوردار بستر ہے

اس سوچ کی سیڑھیاں یہ ہیں کہ دل پیار کے دکھ سے نڈھال ہو جاتا ہے تو آدمی کی طرح بستر پر گر پڑتا ہے۔ یوں دل بستر کا برخوردار ہوا پر بستر پر وہی برخوردار پڑا رہتا ہے جو چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوتا اس لیے دل کو "بے دست و پا افتادہ" کہا گیا۔ جب یہ دوسرا مصرع ہو گیا تو غالب نے پہلے مصرعے کی فکر کی اور دل کے مقابلے پر آنسو باندھنا چاہا کیوں کہ عشق میں دیدہ و دل کی ہی باتیں زیادہ ہوتی ہیں اور آنسو دامن میں گرتا ہے پر لیٹے ہوئے آدمی کا آنسو دامن میں نہیں بستر میں بہہ جاتا ہے اس لیے آنسو عاشق کے دامن میں نہیں گرایا جا سکتا تھا۔ دوسرا دامن میدان کا ہو سکتا تھا جو بستر کی ہی طرح پھیلا ہوتا ہے اس لیے سرشک کو سر بصحرا دادہ کہا گیا اور اب دل اور سرشک دونوں دنگل میں اتار دیئے گئے کہ جس طرح دل بستر کا برخوردار ہے اسی طرح آنسو میدان کا برخوردار ہے۔ برخوردار کا بول دامن کے ساتھ پہلے مصرعے میں بھی سما سکتا تھا پر آنسو کے لیے اسے ٹھیک نہیں سمجھا گیا کیوں کہ دونوں مصرعوں میں ایک ہی بول دہرانا برا لگتا تھا۔ اس کی جگہ اسی کے وزن اور معنی کا دوسرا بول "نور العین" سوچا گیا جو آنسو سے بھی میل کھاتا ہے۔ اتنے جتن سے شعر سوچنے کے بعد بھی اس میں کوئی بات پیدا نہیں ہو سکی اور ردیف کے دہرانے کا عیب اور آ گیا اور جو پورا شعر دیکھا جائے تو دونوں مصرعوں میں ایک ہی مضمون یعنی "برخورداری" کی تکرار ہو گئی۔

قافیوں میں غالب نے کچھ اصطلاحیں بھی باندھی ہیں اور اصطلاحیں اپنے ساتھ ایک پورا پس منظر رکھتی ہیں اس لیے ان کے سہارے مضمون سوچنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے پر شعرا اسی طرح روکھا پھیکا رہتا ہے۔ مثال کے لیے غالب نے ایک غزل میں گریباں اور عریاں جیسے قافیے باندھے ہیں۔ اس کے ساتھ انھیں "دست گرداں" کا قافیہ بھی سوجھ گیا جس کا مطلب ہے "اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے" اسے غالب نے شعر میں یوں باندھا ہے۔

Scanned with CamScanner

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے

اس شعر میں ''گرداں'' کے بول نے ساغر کا بول بُجھایا اور ساغر ساقی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو دین و دل کے بدلے میں ملتا ہے۔ اس لین دین کے لیے بازار، سودا کرنا اور متاع کے بول اکٹھے کر کے شعر کو آسانی سے پکا کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح ایک اور غزل میں جس کا مطلع ہے ''جس جا نسیم شانہ کش زلفِ یار ہے'' یار، بیقرار، انتظار کے قافیے آئے ہیں۔ یہاں غالب کو ایک قافیہ ''روبکار'' بھی یاد آ گیا جو عدالتوں کی ایک اصطلاح ہے اور اس کا باندھنا بھی انھوں نے ضروری سمجھا۔ اس لیے مضمون بنا کر یہ شعر گھڑ دیا۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

دیدہ و دل کی باتیں بہت پرانی ہیں۔ میر تقی میرؔ کہتے ہیں۔

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

اور ان کے جھگڑے کے بارے میں بھی جلیلؔ مانک پوری نے کہا ہے۔

دیکھا جو حُسن یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چُھری دل پہ چل گئی

یوں آنکھوں سے دل کو شکایت پیدا ہونے کی بات شاعروں میں عام ہے جس کی طرف غالب کے اس شعر میں اشارہ ہی کیا جا سکا ہے اور یہ مضمون غالب کو ''روبکار'' کے قافیے نے سُجھایا ہے۔ اب اس قافیے کے سوجھنے کی وجہ ان کا اپنا مقدمہ تھا یا کوئی اور یہ الگ بات ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی ایک اور غزل میں بھی جس کا مطلع ہے ''پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے۔'' مقدمے کے

Scanned with CamScanner

بارے میں ایک پورا قطعہ کہا ہے اور عدالت کی بہت سی اصطلاحیں باندھی ہیں۔ اس میں ان کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

دل و مژگان کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

غالب کی ایک غزل کا مطلع ہے ''نکوہش ہے سزا فریادی بیداد دلبر کی'' جس میں دلبر، ساغر قافیے اور ''کی'' ردیف ہے۔ اس میں غالب نے ''پتھر'' کا قافیہ باندھنا چاہا۔ اب دل، جگر، کلیجا، محل، مکان، گھر بھی پتھر کا ہو سکتا تھا پر یہ سب مذکر ہیں اور وہاں زمین تھی ''پتھر کی'' اس لیے ایک مونث اسم کی ضرورت تھی اور وہ ''دیوار'' ہی ہو سکتی تھی جس سے اور شاعر عام طور پر اور غالب خاص طور پر عاشق کا سر پھڑوایا کرتے ہیں۔ سنیے۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر
مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

اس سے انھوں نے یہ مضمون نکالا کہ عاشق سر پھوڑنے کے لیے ''دیوار پتھر کی'' چاہتا ہے اور اسے انھوں نے شعر میں یوں باندھا۔

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

پتھریلی دیوار سے کپڑے کی دیوار تک پہنچ جانا غالب کے لیے بہت آسان تھا کیوں کہ ان کا سوچ سداد و متضاد چیزوں کے بیچ میں سفر کرتا ہے جیسا کہ میں دوسری جگہ کہہ چکا ہوں۔ اس کے بعد ''قیامت ہے'' کا ٹکڑا بھرتی کا ہے کیوں کہ غالب کا انوکھا مضمون اس سے پہلے ہی پورا ہو چکا تھا۔

Scanned with CamScanner

قافیے نے ایک جگہ اور بھی قیامت ڈھائی ہے۔ غالب کی ایک غزل ہے۔ ''ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن''۔ غزل کہتے وقت غالب کو ایک قافیہ ''پیش دستی'' یاد آ گیا اور اس نے ایک ایسا گرا ہوا مضمون بجھایا کہ غالب جیسے شاعر سے اس کی امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اس شعر کے عاشق اور معشوق دونوں ہی بہت نیچ ذات لگتے ہیں جو دھول دھپے کے بغیر پیار بھی نہیں کر سکتے۔

غالب نے بولوں اور قافیوں کے ساتھ ساتھ محاوروں سے بھی شعروں کے جال بنے ہیں۔ ویسے یہ گن لکھنؤ کے شاعروں کا حصہ مانا جاتا ہے جن کی مثال میں پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی کی مثنوی کا بس ایک ہی شعر دیا جاتا ہے۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں
آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

اب غالب کا بھی ایسا ہی شعر سن لیجیے۔

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ذرا سوچیے تو سہی، کہاں زہر کھانا اور کہاں قسم کھانا اور پھر کہاں ملنے کی قسم کھانا یعنی ملنے سے انکار کرنا یا بچنا۔ قسم کا ایک اور شعر بھی سنتے چلے۔

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

اب ایک اور شعر سنیے۔

Scanned with CamScanner

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

اس شعر میں بھی بات اٹھانا محاورہ ہے اور سر اٹھانا روزمرہ اور وجہ اس تشبیہ کی ''بوجھ'' ہے اور جو اسے بھی محاورہ مانا جائے تو یہاں دنیا کے غم سے چھٹکارا پانے کا مطلب لیا جاسکتا ہے اور یہ سب کھینچا تانی اس لیے ہے کہ غالب کو محاوروں سے شعر گھڑنے کا شوق ہوا تھا۔ اسی غزل کا اور اسی طرح کا تیسرا شعر یہ ہے۔

مہربان ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

یہ تشبیہ میر حسن کی مثنوی کے اس شعر سے لی گئی ہے۔

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ایسے ہی ایک اور شعر میں غالب نے محاورہ بھی باندھا ہے اور محاورے میں صنعت ایہام بھی برتی ہے اور پھر اس بودے سہارے پر پورے شعر کا تانا بانا تیار کیا ہے۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

''دم نکلنا'' کے دو معنی ہوتے ہیں۔ جان نکل جانا یا مرنا اور ہزار جان سے چاہنا اور یہاں دوسرے ہی معنی (چاہنا) مراد ہیں۔ ایسی حالت میں جینا اور دم نکلنا ہم معنی ٹھیرتے ہیں۔ پھر جینے اور مرنے کو ایک ثابت کرنے کے لیے ان دونوں فعلوں کو دلیل کے طور پر کیسے پیش کیا جاسکتا ہے۔ یوں دیکھیے تو اس شعر کی منطق ہی غلط ہے اور یہ بولوں کا ایک گورکھ دھندا بن گیا ہے۔

غالب نے شعر گھڑنے کے لیے بولوں کی بیٹھک سے بھی کام لیا ہے۔ ان کی ایک غزل کا مطلع ہے۔ ''بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے'' جس میں دنیا اور تماشا فاقیے ہیں اور ''مرے

Scanned with CamScanner

آ گے'' ردیف ہے۔اس کے مقطع میں غالب نے اسی اُلٹ پھیر سے کام لیا ہے دیکھیے:

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اس کا پہلا مصرع تو یوں ہی سا ہے جس میں لگ بھگ ایک ہی معنی کے تین بول غالب کی پچ میں لا بٹھائے ہیں۔اس لیے دھیان دینے کے لیے بس دوسرا ہی مصرع ہے جو غالب نے بولوں کی بیٹھک سے بنایا ہے۔ جو اس کا یہ مطلب یہ لیا جائے کہ غالب کو مرے آگے بُرا کیوں کہو تو ''اچھا'' کا بول بیکار ہوا جاتا ہے اور جو یہ سمجھا جائے کہ اچھا! غالب کو مرے آگے بُرا کہتے ہو تو پھر ''کیوں'' کا بول فالتو لگتا ہے اس لیے اس مصرعے کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ غالب کو مرے آگے بُرا کیوں اچھا کہو اور یوں اس مصرعے میں ''اچھا کہو'' کی جگہ بیٹھک بدل کر'' کہو اچھا'' باندھا گیا ہے اور بس یہی شعر کا نرالا پن ہے کیوں کہ نہ پہلا مصرع کہنا کچھ ایسا کٹھن تھا اور نہ اس میں کوئی نئی بات ہی رکھی گئی ہے۔

اب میں غالب کی ایک ترکیب کی طرف دھیان دلاتا ہوں ۔ خالی لینا اور کرنا کے مصدر اردو بولنے والے بھدّے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔اس بات کو سامنے رکھ کر کچھ شاعروں نے ایسے شعر کہے ہیں جن کے پہلے مصرعے میں ان میں کا ایک فعل لے آئے۔اس سے سننے والا یہ سمجھا کہ آگے کوئی بھدّی بات کہی جانے والی ہے پر اس کا یہ دھوکا دوسرا مصرع سن کر دُور ہو جاتا ہے جو پہلے مصرعے کا مضمون سنجیدگی سے پورا کر دیتا ہے غالب کا بھی ایک ایسا ہی شعر سنیے۔

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

اس شعر میں بولوں کی بیٹھک چھوڑ کر اور کوئی باریکی نہیں ہے۔بس جو کچھ گن ہے وہ اسے ایک خاص ڈھنگ سے پڑھنے کا ہے اب اسے یوں پڑھیے اور سمجھے۔

لیتا۔نہ اگر دل تمہیں دیتا۔کوئی دم چین+کرتا۔جو نہ مرتا کوئی دن۔آہ فغاں اور

Scanned with CamScanner

اس کی نثر یہ ہے کہ اگر دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ جو کوئی دن نہ مرتا تو اور آہ و فغاں کرتا۔ یعنی دونوں مصرعوں میں دو شرطی جملے ہیں اور ہر جملے کی شرط کو جزا کے بیچ میں پھنسا دیا ہے۔

آخر میں غالب کے ایسے ہی کچھ اور شعر یہاں لکھے دیتا ہوں۔

تمھیں بنات العش گردوں دن کے پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہو گئیں

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

سراڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے مجھ کو

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے واں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

منھ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر باندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

تمھیں نہیں ہے سررشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

Scanned with CamScanner

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں غالب نے شعر کے باہری اور بھیتری دونوں پہلوؤں کو سنوارا اور اس کا درجہ بہت اونچا کر دیا وہاں ایسے شعر بھی گھڑے ہیں جن میں بولوں اور اصطلاحوں اور محاوروں کے کھیل کھیلے ہیں، قافیے کھپائے ہیں اور بول ذرا آگے پیچھے کر دیئے ہیں۔ ایسے شعروں میں نہ سوچ کی اڑان ہے نہ معنی کی گہرائی نہ اپج ہے نہ کوئی باریکی۔ یہ شعر وہ ہیں جن کے بھیتری پہلو سے بڑھ کر باہری پہلو کی کاٹ چھانٹ اور چوم چاٹ پر دھیان دیا گیا ہے اس لیے سننے پڑھنے والے کے دل پر ان کا وہ اثر نہیں ہوتا جو غالب کے دوسرے شعروں سے پڑتا ہے اور ان سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ خاص شاعر ہی بولوں سے نہیں کھیلتے تھے بلکہ غالب جیسے بڑے شاعر بھی بولوں سے لٹھیاتے رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

کے کتنے ہی بول آ گئے ہیں۔ یہاں ایسے کچھ شعر غزلوں سے نکال کر لکھے جاتے ہیں جن میں ایک آدھ بول ہی اُردو کا آیا ہے۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کفِ بردن صددل پسند آیا

بطوفاں گاہ جوش اضطراب شامِ تنہائی
شعاعِ آفتاب صبح محشر تار بستر ہے

نشہ ہا شاداب رنگ وسازہا مست طرب
شیشۂ مے سروسبز جوئبار نغمہ ہے

حسنِ بے پروا خریدار متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکر اختراعِ جلوہ ہے

غالب نے فارسی کے کچھ ایسے بول بھی برتے ہیں جن کے خاص معنی کا چلن اردو بول چال میں آج تک نہیں ہو پایا ہے جیسے مگر (شاید۔سوائے)، دماغ (برداشت)، تماشا (دیکھنا)، رخصت (اجازت)، ارزانی (نصیب)، معلوم (معدوم۔نہیں)۔ کچھ شعر دیکھیے۔

کعبے کس منھ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

غمِ فراق میں تکلیف سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

Scanned with CamScanner

غالب کی ایک اُلجھن

ادھار کون نہیں لیتا دیتا پر اُدھار کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جب اُدھار حد سے بڑھ جائے تو لوگ چونک اُٹھتے ہیں اور انھیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی بڑی وجہ ہونی چاہیے۔ غالب کو ادھار لینے کا ایک روگ سا لگ گیا تھا کہ جب تک جیتے رہے ادھار میں ہی ڈوبے رہے اور مرے تو بھی آٹھ سو روپے کے دین دار نکلے جوان کی بیوی نے کہیں سے مانگ کر چُکائے۔ مرزا کو شروع سے ۱۸۵۷ء تک انگریزی سرکار سے ساڑھے باسٹھ روپے مہینا پنشن ملتی رہی پر ایسا لگتا ہے کہ اس میں ان کا گزارا نہیں ہو پاتا تھا کیوں کہ ۱۸۵۰ء میں وہ حکیم احسن اللہ خان کی سفارش سے بہادر شاہ کی سرکار میں تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر نوکر ہو گئے تھے اور پچاس روپے مہینا تنخواہ پانے لگے تھے۔ اس پر انھوں نے ایک شعر بھی کہا ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۹ جون ۱۸۵۳ء کو انھوں نے مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھا ہے" یہ تمہارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفریں۔ جے پور سے مجھ کو اگر دو ہزار ہاتھ آ جاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پان سو تو بھائی تمھاری جان کی قسم متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے۔ وہ میرے صرف میں آویں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سو کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بابو

Scanned with CamScanner

صاحب سے منگوائے تھے وہ صرف انگریزی سوداگر کے دیئے تھے۔'' ۲۴ جون کو پھر انھیں لکھتے ہیں

''بھائی جس دن تم کو خط بھیجا تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پان سو کی ہنڈوی پہونچی۔ تم سمجھے بابو صاحب نے پچیس روپے ہردیو سنگھ کے دیے اور مجھ سے مجرانہ لیے۔ بہرحال ہنڈوی ۱۲ دن کی معیادی تھی۔ ۶ دن گزر گئے تھے ۶ دن باقی تھے۔ متی کاٹ کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبک دوش ہو گیا۔ آج میرے پاس [illegible] نقد بکس میں اور ۴ بوتل شراب اور ۳ شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔''

۱۸۵۵ء میں رام پور کے نواب یوسف علی خان ان کے شاگرد ہوئے تو وہاں سے بھی انھیں کچھ مدد ملنے لگی۔ منشی غلام غوث بے خبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''نواب یوسف علی خان بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری۔ انگریزی پنشن کھلا ہوا۔ ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔'' اس زمانے میں بھی جب کہ تین تین جگہ سے آمدنی ہوتی تھی مرزا کے دن شاید ہی اچھے گزرے ہوں کیوں کہ ساڑھے باسٹھ اور پچاس روپے سب ملا کر ایک سو بارہ روپے آٹھ آنے مہینا ہوتے تھے اور نواب صاحب کی رقم گاہ گاہ ہی ملتی تھی۔ مرزا پیسا بچانا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ جو ملتا تھا وہ خرچ کر دیتے تھے پھر اس کے دو ہی برس پیچھے آزادی کی لڑائی ہو گئی تو بہادر شاہ تخت سے اُتر گئے۔ وہاں کی تنخواہ جاتی رہی اور انگریزی سرکار سے جو پنشن ملتی تھی وہ بہادر شاہ کا ساتھ دینے کے شبہے میں روک لی گئی۔ اس کے بعد ان کے ہندو دوست اور شاگرد ان کی خدمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۸۵۹ء سے رام پور کے نواب نے ان کی سو روپے مہینا تنخواہ کر دی جو انھیں ہر مہینے ملنے لگی۔ اس میں ان کی کیا گزر ہو سکتی تھی۔

مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن کھلی اور تین سال کا اکٹھا روپیہ ملا۔ اس کا حساب ۶ مئی ۱۸۶۱ء کے خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں جس سے اس بیچ کے زمانے کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے'' زر سہ سالہ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوئے سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں۔ تین برس کے دو ہزار دو سو

Scanned with CamScanner

پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپے۔ میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرض دار قدیم ہوں۔ اب جو وہ دو ہزار لایا اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندارہ سو اس کے سود' دل کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کروایا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ ۲۶ سو ہوئے۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو۔ پان سو سات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے۔ نو سو باقی رہے۔ آدھے تو لے آدھے مجھے دے''۔ اسی روپے کا حساب مرزا علاؤ الدین احمد خاں کو بھی لکھا ہے۔ ''پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر مجتمعہ سہ سالہ یک مشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپیہ دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنہ مجھے بچے۔''

اس کے بعد مرزا کو سرکاری پنشن اور رام پور کی تنخواہ ملا کر ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے ملنے لگے تھے اور رام پور سے انعام الگ۔ مرزا کی گزر پھر بھی نہیں ہوتی تھی۔ مہاجنوں سے سود پر روپیہ ادھار لیتے رہتے تھے یہاں تک کہ جب آخر میں آ کر ان لوگوں نے بہت کڑے تقاضے کیے تو مرزا نے جو رام پور کے نواب سے اپنے پوتے حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے روپیہ مانگنے کو کئی خط بھیج چکے تھے گھبرا کر انھیں لکھا کہ مجھے آٹھ سو روپے ہی بھیج دو جس سے میرا ادھار چک جائے اور عزت بچ جائے۔ میں حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے پھر روپیہ نہیں مانگوں گا۔

مرزا کی اس پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ ان کی آمدنی ان کا خرچ پورا نہیں کر پاتی تھی اور خرچ اس ٹھاٹھ باٹ کا تھا جو وہ رکھتے تھے اور رکھنا چاہتے تھے۔ وہ گھر سے باہر پینس میں نکلتے تھے اور گھر میں کتنے ہی نوکر چاکر رکھتے تھے جن کا ذکر اپنی کئی چٹھیوں میں کرتے ہیں۔ وہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں ''اب خاص اپنا رونا روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے۔ کلو کلیان ایاز یہ باہر' مداری کی جورو بچے گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھسن گئے گئے مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمدنی نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود''۔

Scanned with CamScanner

ایک اور خط میں مولانا علائی کو لکھتے ہیں۔ ''انکم ٹیکس جُدا، چوکیدار جُدا، سود جُدا، مول جُدا، بی بی جُدا، بچے جُدا، شاگرد پیشہ جُدا۔ آمدو ہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔'' یہ ٹھاٹ رکھنے کے لیے مرزا کو ادھار سے کام چلانا پڑتا تھا پر سوال یہ ہے کہ وہ آمدنی سے اپنا خرچ کیوں نہیں گھٹاتے تھے۔ اس کا حال ان کے اس خط سے کھلتا ہے جو انھوں نے مرزا قربان علی بیگ کو لکھا ہے۔

''میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں۔ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا الھڈ مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشین خطاب دیئے ہیں چوں کہ یہ اپنے کو شاہ قلم رونخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرض دار بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب اور خاں صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حُرمتی ہو رہی ہے کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا خاک، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔'' یہی بات انھوں نے اپنے ایک شعر میں بھی کہی ہے۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا کی ان باتوں سے پتا لگتا ہے کہ ادھار کی ان پریشانیوں میں بھی انھیں اپنے بڑے آدمی ہونے کا برابر دھیان رہتا تھا اور دھیان کیوں نہ ہوتا جب کہ اپنا بڑکپن اور بڑکپن کا بھرم رکھنے ہی کے لیے وہ یہ سب کھکیڑیں اٹھاتے تھے اور یہیں اس سوال کا بھی جواب مل جاتا ہے کہ وہ اپنا خرچ کیوں نہیں گھٹاتے تھے جس سے اپنی آمدنی میں ہی پور پڑتی رہتی۔ مرزا کی پوری زندگی کٹ گئی

Scanned with CamScanner

اور وہ اپنے اونچے گھرانے، ریاست اور ناموری ہی کے گیت گاتے رہے۔ ان دنوں میں بھی جب کہ دلی میں سب کو اپنی اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی مرزا ایک ہی راگ الاپتے رہے۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں جو لکھا ہے کہ مرزا کے دروازے پر لولے لنگڑے اور اپاہج فقیروں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اس کا کارن بھی یہی تھا کہ وہ ایسے لوگوں کی مدد کر کے ہی اپنے بڑکپن کا بھرم رکھ سکتے تھے۔

جب دہلی کالج میں فارسی پڑھانے ۱۰ لے کی ایک جگہ بڑھائی گئی تو حکومت ہند کے سیکرٹری مسٹر طامسن صاحب نے مرزا غالب کو بلایا۔ یہ پالکی پر ان کے یہاں پہنچے پر پالکی سے اس لیے نہیں اُترے کہ طامسن صاحب آپ انھیں لینے آئیں۔ جب طامسن صاحب کو یہ پتا چلا تو وہ باہر آئے اور مرزا سے کہا کہ ''جب آپ گورنر کے دربار میں آئیں گے تو آپ کی آؤ بھگت اسی طرح کی جائے گی۔ اس گھڑی آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس لیے ویسا برتاؤ نہیں ہو سکتا''۔ مرزا نے جواب دیا کہ ''گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو یا اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔'' صاحب نے جواب دیا کہ ''ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔'' اس پر غالب یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھ کو اس ملازمت سے معاف رکھا جائے۔

کچھ لوگ اسے مرزا کی خودداری کہتے ہیں جیسا کہ ان کے ان شعروں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

پر مکاتیب غالب پڑھ کر اس خودداری کا کہیں کھوج تک نہیں ملتا۔ انھوں نے رام پور کے نواب سے روپے مانگنے میں ذرا سی بھی جھجک نہیں دکھائی نہ روپے مانگنے کا کوئی ڈھب ہی چھوڑا۔ یہ لکھتے ہیں کہ مانگتے شرم آتی ہے اور پھر مانگتے بھی جاتے ہیں۔ کبھی قصیدے کے بہانے اور کبھی کسی اور

Scanned with CamScanner

بہانے سے انعام مانگتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں کہ تنخواہ میں سے یہ رقم نہ کاٹی جائے۔ اپنے پوتے حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے روپیہ مانگنے کو لگاتار چھ چٹھیاں لکھیں آخر جب ادھار مانگنے والے غائب کی جان کھانے لگے تو گھبرا کے لکھا کہ بلا سے آٹھ سو روپے ہی بھیج دو جس سے میری لاج تو رہ جائے۔ میں اب حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے روپیہ نہیں مانگوں گا۔

اس کے لیے ان کے کچھ خطوں سے مثالیں لکھتا ہوں۔ ذرا مرزا کا لہجہ دیکھیے۔

''آپ کے اس تکیہ دار روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔

(خط نمبری ۱۰/۵۴ مکاتیب غالب)

''ماہِ صیام میں سلاطین و امراء خیرات کرتے ہیں اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی صیغے میں ہو جائے اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے۔''

(خط نمبری ۵۹/۱۰۳ مکاتیب غالب)

''دوسری بات یہ ہے کہ سو روپے آپ کی سرکار سے بطریق خیرات اور ۶ مہینا انگریزی سرکار سے بعوض جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔''

(خط نمبری ۵۳/۹۶ مکاتیب غالب)

آخری خط سب سے زیادہ مزے دار ہے جس کے ایک ہی جملے میں اپنے آپ کو فقیر بھی بتایا ہے اور جاگیردار بھی جتایا ہے اور یہی مرزا کی الجھن تھی۔

مرزا کو اپنے اونچے گھرانے پر بہت گھمنڈ تھا۔ منشی حبیب اللہ خان ذکا کو ایک بار یوں لکھتے ہیں۔ ''میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری بریت کی درخواست گزری، تحقیقات ہوتی رہی۔

Scanned with CamScanner

تین برس کے بعد بند چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا۔ غرضکہ یہ خلعت ریاست کا ہے، عوض خدمت نہیں، انعامی نہیں۔'' ایک چٹھی میں اپنی کتاب چھپوانے کے سلسلے میں منشی شونرائن کو یہ ہدایت لکھی ہے،'' سنو میری جان، نوابی کا مجھ کو خطاب ہے نجم الدولہ اور اطراف و جوانب کے امراء سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر نواب اسد اللہ خان لکھا لیکن یاد رہے نواب کے لفظ کے ساتھ مرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا نواب اسد اللہ خان لکھو یا میرزا اسد اللہ خان لکھو اور بہادر کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے''۔ ایک چٹھی میں سید غلام حسین قدر بلگرامی کو اپنے مان مہت کے لیے یوں لکھتے ہیں۔'' میر صاحب ماجرا یہ ہے کہ میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں لمبر اور سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہوگئی لیکن دربار اور خلعت بند۔''

وہ بار بار لوگوں کو لکھتے ہیں کہ خط پر میرا نام اور دہلی لکھ کر بھیج دیا کرو مجھ تک پہنچ جائے گا۔ خط جس ڈاک خانے سے چلتا ہے وہیں رہ جائے تو رہ جائے۔ دہلی کے ڈاک خانے میں نہیں کھوسکتا۔ انھوں نے جگہ جگہ یہ جتایا ہے کہ فارسی اور انگریزی کے خط بھی جو انگلستان سے میرے نام آتے ہیں دہلی کے پتے پر مل جاتے ہیں جب کہ ان پر محلہ بلی ماروں کا نام بھی نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ نامور آدمیوں کے خط میں لمبے چوڑے پتے کی ضرورت نہیں ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی نامور آدمی ہوں۔ وہ ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں'' بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضروری نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں مگر فارسی انگریزی خط جو میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے۔'' مرزا علاؤالدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں،'' قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ

Scanned with CamScanner

ایسے ہیں کہ محلّہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلّہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی وانگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ مگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلّہ اور تھانہ نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔"

ان کی یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتے ہی نہیں تھے دوسروں کو جتانا بھی چاہتے تھے۔ ان کی اس الجھن کا کوئی نہ کوئی کارن ہونا چاہیے کیوں کہ اونچے اونچے گھرانوں کے لوگ بھی کبھی کبھی مٹ جاتے ہیں اور پھر زمانے سے سمجھوتا کر کے اپنی روکھی سوکھی پر ہی دن کاٹنے لگتے ہیں۔ نہ وہ اپنا بڑکپن کسی کو جتاتے ہیں نہ مرزا کی سی شاہ خرچی کر کے ادھار کے دکھوں میں ہی پھنستے ہیں۔ ان لوگوں کی زبان پر اپنے بڑکپن کی بات صرف اس گھڑی آتی ہے جب ان کی ساکھ اور آبرو پر چوٹ پڑتی ہو۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ کیا سچ مچ مرزا پر بھی کوئی ایسی گھڑی آئی تھی اور کوئی ایسی بپتا پڑی تھی جس نے ان کی خاندانی عزت میں بٹا لگایا ہو۔ ان کا ایک شعر ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

کہنے کو تو یہ ایک غزل کا مقطع ہے اور اس میں کہی ہوئی بے آبروئی کی بات تفریحی سمجھی جا سکتی ہے پر ہمیں سچ مچ بے آبروئی کی بات کا ذکر ان کے ایک خط میں بھی ملتا ہے۔ ۱۸۵۲ء میں مرزا کا تعلق جے پور سے قائم ہوا تو مرزا تفتہ نے اس کی تفصیل پوچھی اور لکھا کہ وہاں میرا بھی خیال رہے۔ اس کے جواب میں دس دسمبر ۱۸۵۳ء کو وہ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "جے پور کا امر محض اتفاقی ہے۔ بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہوس ناکانہ ادھر متوجہ ہوا ہوں بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں۔ سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ہاں

Scanned with CamScanner

استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں کچھ فائدہ اٹھاؤں۔ کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کردوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔"

مرزا کی اس بدنامی کے واقعے کا حال مولانا عرشی نے مکاتیب غالب میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۷ء میں فیض الحسن خان کوتوال دہلی کے ہاتھوں قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے اور چھ مہینے کی بامشقت قید اور دو سو روپے جرمانے کی سزا پائی۔ اس واقعے کی جزئیات بے حد افسوس ناک تھیں۔ کوتوال نے گرفتاری کے وقت اور مجسٹریٹ نے سزا کی تجویز میں ان کی وجاہت و شرافت کا قطعاً لحاظ نہ کیا۔ پولیس اور عدالت کے اس نامناسب سلوک سے ان کی حس غیرت سخت مجروح ہوئی۔ خود اپنی نظر میں شرافت خاندان پر دھبہ آ گیا اور وہ اپنے کو روسائے ہندوستان سے ملنے جلنے کے قابل شمار کرنے میں پس و پیش کرنے لگے۔"

اس واقعے سے متعلق مولانا عرشی نے حاشیے میں "فوائد الناظرین جلد دوم ۱۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کے صفحہ ۸۰ پر لکھی ہوئی عبارت نقل کی ہے۔ "۲۵ ماہ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خان صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پا کر وہاں گئے اور جناب میرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کر کر توالی میں لے آئے اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں" اور شاہ نصیر کے ایک شاگرد گھنشیام لال عاصی دہلوی کی عبارت بھی دہرائی ہے۔

"مرزا نوشہ شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خان کوتوال کو ناحق کی عداوت پیدا ہو گئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرا دیا جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی۔

سر ابجد سے فصلی میں تو سب اظہار طوفاں ہے
اور اٹھارہ سو سینتالیس میں قید غریباں ہے
"قلق غالب" نہ کیونکر موش اور گربے کے دل پر ہو
دبی بلی کٹاتی کان چوہوں سے بدنداں ہے

Scanned with CamScanner

رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیونکر ہو
''زنِ غمخوار'' واں بن کر گیا فیض الحسن خاں ہے
سربازو پکڑ کر شحنۂ تقدیر نے عاصیؔ
اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بزنداں ہے

بروقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقعہ پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان سے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی مگر زینہ کے اندر جمعیت بہت تھی اور کچھ امدادی برقنداز پہنچ گئے گرفتار کر کے قید کرا دیا۔ بہت سے رئیس اور شرفاء اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں برأت کے ساعی ہوئے مگر قید ہو ہی گئے''۔

اس بے آبروئی کا مرزا کو جو دکھ پہنچا اور بدنامی کا ان کے دل پر جو گہرا اثر پڑا اس نے ان کے ذہن میں عمر بھر کے لیے ایک الجھن پیدا کر دی۔ وہ اپنے من کو یہ نہیں سمجھا سکے کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی جو ہو گئی کہ کوتوال نے ان سے اپنا بیر یوں نکالا اور اپنا کمینہ پن دکھایا۔ اس اخلاقی دھبے کو دھونے کے لیے میرزا نے یہ کوشش کی کہ کسی ریاست میں استاد یا پیر یا مداح بن کر پہنچوں اور یہ طریقہ بہت مناسب تھا۔ جے پور کی ریاست سے تعلق پیدا ہونے کا جو موقع آیا وہ اسی کوشش کا نتیجہ تھا اور جب وہاں بیل منڈھے نہیں چڑھی تو انھوں نے رام پور کی ریاست میں استاد بن کر دخل کیا۔ پر ایسا لگتا ہے کہ اس سے بھی مرزا کے دل کو تسلی نہیں ہوئی اس لیے انھوں نے آپ ہی اپنے اونچے گھرانے اپنی ریاست اور اپنی ناموری کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ یہ طریقہ غلط تھا کیوں کہ اس کے لیے انھیں امیرانہ ٹھاٹ رکھنا ضروری ہو گیا اور جب ان کی آمدنی نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو انھوں نے ادھار لے لے کر کام چلایا اور مرتے دم تک اس کی پریشانیاں بھگتتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بے عزتی کا یہ نامراد واقعہ ان کے دھیان سے کبھی نہیں نکلا اور ایک روگ بن کر ان کے ذہن سے آخر تک چمٹا رہا۔

Scanned with CamScanner

غالب کی سوچ کا دھارا

شاعری کی ٹھیک ٹھیک پرکھ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہوتی ہے کہ پارکھ اپنا سوچ بچار سب سے آگے رکھتا ہے اور اس کے سہارے کے لیے شاعر کا کلام سناتا جاتا ہے پر شاعر من موجی ہوتا ہے اور من کی موج پل پل بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ جو بات ایک وقت میں کہہ جاتا ہے دوسرے وقت میں اس کی کاٹ بھی کر دیتا ہے۔ اس طرح غالب کے شعروں کا سہارا لے کر ہر ایک اپنے اپنے مطلب کی بات ثابت کر سکتا ہے چاہے دو باتوں میں پورب پچھم کا ساہل ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری طرف کوئی چاہے تو غالب کی تک بندیوں کو بھی اپنی منطق کے بل بوتے پر بہت اونچی شاعری بنا کر دکھا سکتا ہے اور ان کے اچھے شعروں کو بہت نیچے گرا سکتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کے ہی سوچ بچار میں اتر کر اس کے بہاؤ اور چال کو نہارا جائے۔ اس کی گہرائی چوڑائی ناپی جائے۔ اس کے بیچ بیچ میں نکلے ہوئے ٹیلوں ٹاپوؤں کا کھوج لگایا جائے اور پھر یہ طے کیا جائے کہ غالب کے سوچ کا ڈھب اور بھاؤ کا رنگ کیا ہے۔ غالب کی شاعری کو پرکھنے کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ڈھنگ نہیں ہو سکتا۔

کہنے کو تو غالب نے اردو میں غزلیں، قصیدے اور مثنویاں کہی ہیں۔ الگ سے قطعے اور مرثیے کے تین بند بھی لکھے ہیں اور ایک سہرا بھی کہا ہے پر غزلوں کی گنتی سب سے بڑھی ہوئی ہے اور غزل کا قاعدہ سدا سے یہ چلا آ رہا ہے کہ اس کا ہر شعر ایک الگ مضمون رکھتا ہے اسی لیے کلیم الدین احمد کو اردو شاعری میں دھجیاں اور پرزے دکھائی دیئے تھے۔ پر غالب کا سوچ ایک ہی سیدھی لکیر پر چلتا ہے اور زیادہ دیر تک چلتا رہتا ہے یعنی وہ ایک بات کو ایک سے زیادہ شعروں میں پورا کر پاتے ہیں اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں میں بہت سے قطعے کہے ہیں جن میں

Scanned with CamScanner

کبھی دو اور کبھی دو سے زیادہ شعر ملتے ہیں۔ نیچے ان کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں۔

(ا) دو شعر کے قطعے:

(۱)

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

(۲)

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

(۳)

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ
حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

(ب) دو سے زیادہ شعر کے قطعے جن کی تفصیل نیچے دی جاتی ہے۔

غزل کا مطلع	قطعے کے شعروں کی گنتی	مضمون
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب	۹ شعر	برسات کا حال
آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست	۵ شعر	عاشق اور رقیب کی بات چیت

Scanned with CamScanner

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے	۴ شعر	تصوف کی باریکیاں
پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے	۵ شعر	کچہری کی اصطلاحیں
ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	۷ شعر	محفل کا بسنا اور اُجڑنا
نویدِ امن ہے بیدادِ دوستِ جاں کے لیے	۵ شعر	تجمل حسین خاں کا عیش
شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے	۴ شعر	بادشاہ کی تعریف

(ج) ان قطعوں کو چھوڑ کر جن کی نشان دہی دیوان میں کر دی گئی ہے بہت سی غزلوں میں لگاتار ایسے شعر بھی ملتے ہیں جنھیں قطعہ تو ظاہر نہیں کیا گیا پر ان میں مضمون ایک ہی بیان ہوا ہے جیسے۔

(۱)

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

(۲)

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

Scanned with CamScanner

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانی روش و مستی ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے

ان قطعوں اور شعروں کے ساتھ ساتھ جن میں غالب کا سوچ برابر ایک ہی نکتے پر کام کرتا رہتا ہے ان کی ایسی پوری پوری غزلیں بھی ملتی ہیں جنھیں مسلسل کہا جا سکتا ہے۔ ان غزلوں کے مطلعے یہ ہیں۔ شب کہ برق سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا۔ حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد۔ لازم تھا کہ دیکھو میرا رستا کوئی دن اور۔ درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے۔ ان میں سے ہر غزل غالب کے سوچ کا ایک ہی پہلو سامنے لاتی ہے مثلاً پہلی غزل میں جدائی کی رات کا حال لکھا ہے اور عاشق اور معشوق کی حالت کا مقابلہ کیا ہے۔ دوسری میں اپنے مرنے کے بعد حُسن اور عشق کی کس مپرسی کا ذکر ہے۔ تیسری میں جسے عارف کا مرثیہ بھی کہتے ہیں، عارف کے مرنے پر غالب نے اپنا دُکھ رویا ہے۔ چوتھی بھی شاید کسی معشوق کا مرثیہ ہے اور پانچویں غزل میں معشوق کے لیے اپنے جی کی بے کلی اور تڑپ دکھائی ہے اس طرح ہر غزل میں شروع سے آخر تک ایک ہی آہنگ ملتا ہے۔

غالب کے سوچ کا یہ لگاتار سفر ان کے قطعوں اور غزلوں سے تو ظاہر ہوتا ہی ہے ان کے کچھ شعروں کے مضمون سے بھی ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے پر ایسے شعر بہت کم ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اس شعر میں غالب کے سوچ نے عاشق کے زخم جگر سے معشوق کے دست و بازو تک

Scanned with CamScanner

جتنی آسانی سے سفر کیا ہے اسے کتنا ہی سراہیے کم ہے۔ مزہ یہ ہے کہ گھاؤ کی گہرائی کا کہیں چرچا نہیں ہے۔ پر نظر لگنے کا ڈر جو معشوق کے دست و بازو کی طاقت کا ثبوت ہے کڑی کمان اور اس کے تیر کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے اور یہ پورا سماں اس سفر کی ایک سیدھی اور لمبی لکیر سے دھیرے دھیرے یوں ابھرتا ہے جیسے کاغذ کو آگ دکھانے سے حروف اُجلتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور شعر دیکھیے۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخُو ہوگا
نبض خس سے تپش شعلۂ سوزاں سمجھا

اس شعر میں بھی غالب کا سوچ عاشق کے عجز سے بنا کسی رکاوٹ کے سیدھا معشوق کی بدخوئی تک جا پہنچا ہے اور یہ بھی پہلے شعر کی طرح سجاوٹ اور بناوٹ سے خالی ایک سادہ سا شعر ہے۔ اسی قسم کا ایک تیسرا شعر بھی سن لیجیے۔

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اس شعر میں غالب کا دھیان معشوق کی بیماری سے جھٹ عاشق کی آہ کی طرف چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ ایک بات کو سبب اور دوسری کو اس کا نتیجہ ٹھہراتا ہے۔

اسے غالب کی بے بسی کہہ لیجیے کہ وہ ایک شعر میں پورا نکتہ سمو نہیں پاتے یا ان کا شوق کہہ لیجیے کہ ایک شعر کہہ کر ان کا جی نہیں بھرتا اور وہ الگ الگ کتنے ہی شعروں میں بار بار وہی پورے کا پورا مضمون یا اس کے ٹکڑے باندھتے رہتے ہیں۔ شاید اسی لیے مضمونوں کی جتنی تکرار ان کے دیوان میں ملتی ہے دوسرے شاعر کے یہاں ملنا کٹھن ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ غالب غزل سے زیادہ نظم کے لیے موزوں تھے کیوں کہ ان کے سوچ میں پھیلاؤ بہت تھا اور وہ اپنے مضمون کا چپا چپا چمکا دینا چاہتے تھے اور یہ بات ایک شعر کہہ کر ہاتھ نہیں آ سکتی تھی۔ شاید اسی مجبوری نے ان سے یہ شعر کہلوایا ہے۔

Scanned with CamScanner

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

آدمی کا سوچ دو ڈھنگ سے آگے بڑھتا ہے۔ وہ ایک چیز سے یا تو کسی دوسری ملتی جلتی سی چیز کی طرف چلتا ہے اور یا کسی ایسی بات کی طرف پلٹ جاتا ہے جو پہلی سے الٹی ہو جیسے کاغذ کا نام آتے ہی ہمارا دھیان تڑت قلم اور روشنائی کی طرف پھر جاتا ہے یا دن سے رات کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ ڈھنگ شعر کے گن مانے جاتے ہیں اور انھیں شعر کی دنیا میں رعایت لفظی یا صنعت مراعات النظیر اور صنعت تضاد کہتے ہیں۔ غالب کے یہاں سوچ کے یہ دونوں ڈھنگ شعر کے گن بن کر سامنے آتے ہیں اور شعر کو اتنا پکا بنا دیتے ہیں کہ پڑھنے سننے والے پر جادو سا ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے دو آسان سے شعر دیکھیے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

پہلے شعر کے دشت اور گھر دونوں میں ہی ویرانی کا گن ملتا ہے۔ اسی لیے دشت کو دیکھ کر گھر یاد آ جاتا ہے اور دوسرے شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ فلک اور معشوق دونوں میں جفا پائی جاتی ہے اس لیے ایک کو دیکھ کر دوسرے کا آنکھوں میں پھر جانا سیدھے سبھاؤ کی بات ہے۔

اب کچھ ایسے شعر سنیے جن میں غالب کا سوچ دو اضداد کے بیچ میں سفر کرتا رہتا ہے اور جیسا کہ میں دوسری جگہ کہہ چکا ہوں ان کے یہاں اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

Scanned with CamScanner

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آدے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

ان شعروں میں کافر اور مسلمان، گرم اور ٹھنڈا، محبت اور عداوت، بناؤ اور بگڑنا ایسے بولوں کے جوڑے اکٹھے کر دیے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے اُلٹے ہیں۔

یہاں تک تو بات سیدھی رہتی ہے اور سمجھ میں بھی آسانی سے آجاتی ہے پر اتنی سیدھی سادی اور سُرت سمجھ میں آجانے والی باتوں سے غالب کا جی نہیں بھرتا اس لیے انھوں نے کچھ ایسے شعر بھی کہہ ڈالے ہیں جن میں ملتی جلتی اور اُلٹی باتیں اکٹھی کر دی ہیں اور اپنی استادی کا لوہا منوانے کے لیے انھیں کچھ ایسے پیچ رکھ کر جوڑ دیا ہے کہ وہ شعر منطقی مغالطے بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے سوچ کی ان قلابازیوں میں بناوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ ان کا ایک شعر ہے۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اس کے پہلے مصرعے میں غالب نے دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کی رونق اس عشق سے قائم ہے جو گھر اجاڑتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں وہ اس رونق کو انجمن کی شمع سے اور عشق کو خرمن کی برق سے تشبیہ دے کر شمع اور برق میں ناتا جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پر یہ ناتا اس لیے نہیں جُو پاتا کہ شمع کی روشنی تو انجمن کو رونق دیتی ہے اور برق کی آگ خرمن پھونک ڈالتی ہے یعنی دونوں میں تشبیہ کی وجہ ایک نہیں ہے۔ پھر یہ کہ جس طرح اُجڑنے والا گھر دنیا میں ہی شامل ہے۔ اس طرح خرمن کسی انجمن کا ایک انگ نہیں بن سکتا۔

Scanned with CamScanner

اسی طرح ان کا ایک اور شعر ہے۔

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

غالب اس شعر کے پہلے مصرعے میں ایک عام اصول بیان کرتے ہیں کہ عاشق بپتا کی گود میں پل کر پکا ہوتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مونگا سمندر کے تھپیڑوں میں ہی مونگا بنتا ہے اس طرح انھوں نے بپتا کی گود کو سمندر سے اور عاشق کو مونگے سے تشبیہہ دی ہے پر اس کے بعد غالب نے ایک چھلانگ اور لگائی اور سمندر کو آندھی سے اور مونگے کو جلتے دیئے سے بھی تشبیہہ دے ڈالی کیوں کہ مونگے پر سمندر کے تھپیڑوں سے جو کچھ بیتتی ہے وہ اس مصیبت سے ملتی ہوئی ہے جو آندھی کے جھونکوں سے دیے پر آتی ہے۔ پر یہاں غالب کی دوسری تشبیہہ اور اس کا تانا بانا غالب کی باتیں ہی باتیں ہیں کیوں کہ ہوتا یہ ہے کہ مونگا سمندر میں پلتا ہے اور دیا آندھی میں بجھ جایا کرتا ہے یعنی مونگے اور سمندر کا ناتا پیار کا اور دیے اور آندھی کا ناتا بیر کا ہے۔ یوں غالب نے ایک کے پیچھے دوسری تشبیہہ دے کر ایک اَن ہونی بات کو ہونی کر دکھایا ہے اور ملتی جُلتی اور اُلٹی باتوں کو اکٹھا کر کے لوگوں کو چونکا دینے کا جتن کیا ہے۔ غالب کے پارکھ یہ بات بہت زور شور سے بیان کرتے ہیں کہ غالب عام ڈگر پر چلنا اچھا نہیں سمجھتے تھے اور عام لوگوں کی باتیں اپنانے میں اپنی ہیٹی جانتے تھے۔ وہ جب دلّی کی عام بیماری سے بچ گئے تو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں نے وبائے عام میں مرنا پسند نہیں کیا۔ عام رسموں کے خلاف اسی طرح کی باتیں انھوں نے کچھ شعروں میں بھی کہی ہیں جیسے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

ہیں اہلِ خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

Scanned with CamScanner

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

غالب کی انھیں باتوں نے لوگوں کو بہت بھٹکایا اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ غالب نے خالی شعروں میں ہی نیا پن نہیں دکھایا وہ اپنے رہن سہن میں بھی سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ پر جب ہم غالب کے شعروں کے سہارے ان کے سوچ کی گہرائیوں میں جھانکتے ہیں تو ہمیں ان کا نکاس دکھائی دینے لگتا ہے اور ہم غالب کے اس علمی خزانے تک پہنچ جاتے ہیں جس میں عام لوگ بھی برابر کے حصہ دار ہیں۔

ان کے کچھ شعر دیکھیے جن میں پرانے قصوں کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں اک داغ نہاں اور
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

پہلے شعر میں حضرت موسیٰ کا وہ معجزہ چھپا ہوا ہے جسے ید بیضا کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے اس ہاتھ کو جو بچپن میں جل گیا تھا خدا نے یہ معجزہ دیا تھا کہ جب حضرت موسیٰ اسے اپنی بغل سے نکالتے تھے تو اس کی چمک سے لوگوں کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ دوسرے شعر میں حضرت زکریا کا قصہ جھلک رہا ہے، جن کو لوگوں نے کوئی تہمت رکھ کر آرے سے چیر دیا تھا۔

اب کچھ شعر نیچے لکھے جاتے ہیں جو پرانی حکایتوں کی یاد دلاتے ہیں۔

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کافی ہے نشانی تیرا چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

پہلے شعر سے مجنوں کا وہ قصہ یاد آتا ہے جب اس نے ایک بار اپنا حال لکھ کر کسی آدمی کو لیلیٰ تک پہنچانے کے لیے ایک چٹھی دی تو اس کو اپنا حال کچھ زبانی بھی بتلانے لگا کہ لیلیٰ سے یہ بھی کہنا اور یہ بھی کہنا اور یہ زبانی پیغام اتنا لمبا ہو گیا کہ وہ باتیں کرتے کرتے قاصد کے ساتھ ساتھ لیلیٰ کے گھر جا پہنچا۔ دوسرا شعر نادر شاہ کا وہ قصہ یاد دلاتا ہے کہ جب وہ ہندوستان آیا اور اسے ہاتھی پر بٹھایا گیا تو اس نے اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے اس کی لگام مانگی پر جب اسے یہ بتایا گیا کہ ہاتھی کے لگام ہی نہیں لگتی تو کہنے لگا کہ اسے روک دو۔ میں ایسی سواری پر نہیں بیٹھنا چاہتا جس کی لگام اپنے ہاتھ میں نہ ہو۔ تیسرے شعر میں ایک مشہور کہانی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ریت یہ ہے کہ چلتے وقت نشانی کے لیے چھلا یا انگوٹھی دی جاتی ہے۔ پر ایک آدمی بہت ہی کنجوس تھا جب اس کے دوست نے چلتے وقت نشانی کے لیے اس سے انگوٹھی مانگی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم اپنی خالی انگلی دیکھ کر ہی مجھے یاد کر لیا کرنا۔

نیچے دیے ہوئے دو شعروں میں ایک اصطلاح باندھی گئی ہے اور وہ بھی ہمارے سماج کی ایک ریت پر قائم ہے۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

ان دونوں شعروں میں شاعر نے ''کھٹکا'' کا بول باندھا ہے جس کے ایک معنی ڈر کے ہیں پر میرا دل کہتا ہے کہ یہ شعر کہتے وقت غالب کے دھیان میں وہ خالی کنستر بھی ضرور تھا جسے مالی رسی کے ایک سرے سے باندھ کر پھل دار پیڑ کی کسی ٹہنی میں لٹکا دیتا ہے اور رسی کا دوسرا سرا اپنے ہاتھ

Scanned with CamScanner

میں رکھتا ہے جب چڑیاں اور توتے پھل کھانے کے لیے پیڑ پر آ کر بیٹھتے ہیں تو وہ رسی کھینچ دیتا ہے جس سے کنستر ٹہنی سے ٹکرا کر بجنے لگتا ہے اور اس کے ڈر سے پرند اڑ جاتے ہیں۔ اس کنستر کو کھٹکا کہتے ہیں۔

ان کے ساتھ ساتھ کچھ اور شعر بھی دیکھیے۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

عشرت قتل گہہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

پہلے شعر کا مضمون فارسی کی کہاوت ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' سے لیا گیا ہے دوسرے شعر میں عید کا چاند کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے جو تلوار کا سا روپ رکھتا ہے اور تیسرے شعر کو اس وہم نے جنم دیا ہے جو عام لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ جن جانوروں کی جون بھی بدل لیتے ہیں اسی لیے کچھ لوگ جمعرات کو کالی بلی یا کالے کتے کو نہیں مارتے کہ کہیں اس کے بھیس میں کوئی جن نہ آ گیا ہو یا پھر اس شعر کے نیچے فارسی کا یہ شعر چھپا ہوا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

آخر میں میں کچھ ایسے شعر سناتا ہوں جن کا ڈھانچا سماج کی کسی نہ کسی ریت پر رکھا گیا ہے۔

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

Scanned with CamScanner

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھواوے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

پہلا شعر رنڈی کے دھیان سے ابھرا ہے جس کا دھندا پیسے سے چلتا ہے۔ دوسرے شعر کی پیدائش کو قیس کی اس تصویر سے سہارا ملا ہے جو اسے نگاہی پیش کرتی ہے۔ غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں بھی لکھا ہے کہ ''مجنوں کی تصویر باتن عریاں ہی کھینچتی ہے'' (عود ہندی خط ۱۳۹) یعنی دوسرا شعر بھی ایک رسم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تیسرے شعر نے جس رسم سے جنم لیا ہے وہ یہ تھی کہ ایران میں فریادی کاغذ کا لباس پہن کر حاکم کے سامنے جایا کرتا تھا۔ یہ بات غالب نے بھی ایک خط میں آپ بتائی ہے۔ چوتھے شعر میں غالب بتاتے ہیں کہ کچھ عاشق اس خیال سے کہ ان کا خط نہ پکڑا جائے اپنے معشوق کو پیاز کے رس یا اور کسی ایسے ہی رس سے خط لکھتے ہیں جو دیکھنے میں تو کورا کاغذ لگتا ہے پر آگ دکھانے سے اس کے حروف اُبھر آتے ہیں اور مضمون پڑھ لیا جاتا ہے۔ پانچویں شعر میں انھوں نے ان منشیوں کی تصویر کھینچی ہے جو خط لکھ کر روزی کماتے ہیں اور صبح صبح گھر سے نکل کر ان پڑھوں کے گھر کا چکر لگاتے ہیں۔ یہ لوگ آج کل ڈاک خانوں کے آگے دری یا ٹاٹ پر بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔

ان شعروں کو دیکھتے ہوئے یہ کون کہہ سکتا ہے کہ غالب ان قصے کہانیوں، واہموں اور سماجی ریت رسموں سے الگ ہٹ کر شعر لکھتے تھے جو عام لوگوں کی سماجی میراث کا ایک حصہ

Scanned with CamScanner

ہیں۔ غالب نے آپ بھی عام ڈگر سے بچ کر چلنے کی جو ہوا باندھی ہے وہ بس لوگوں کو چونکانے اور اپنی طرف دھیان دلانے کے لیے باندھی ہے کیوں کہ یہ سب باتیں جن پر انھوں نے اپنے شعروں کے ڈھانچے کھڑے کیے ہیں وہی ہیں جو غالب کے آس پاس عام لوگوں میں پائی جاتی تھیں اور جن پر وہ نہ جانے کب سے عمل کرتے چلے آ رہے تھے۔ پھر ایسی ہی باتوں، کہانیوں اور ریتوں کے چرچے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

غالب کے یہاں کچھ ایسے بول بھی دکھائی دیتے ہیں جن کے معنی عام بول چال سے تھوڑے سے ہٹے ہوئے ہیں۔ انھیں علامت کہتے ہیں۔ مثال کے لیے ان کا ایک شعر سنیے:

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

قیامت اس دن کو کہتے ہیں جب دنیا کے سب کے سب آدمی مرنے کے بعد ایک لمبے چوڑے میدان میں اکٹھے ہوں گے اور اللہ کو اپنے اپنے کیے ہوئے کاموں کا حساب دیں گے یا پھر قیامت کے معنی بہت بڑی مصیبت کے بھی ہیں جیسا کہ غالب نے بھی کہا ہے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

پر پہلے شعر میں قیامت کا بول ایک علامت کے طور پر آیا ہے اور یہاں غالب نے اس بول سے وہ ہل چل مراد لی ہے جو معشوق کے بچھڑتے وقت عاشق کے دل میں مچ گئی تھی۔ اسی طرح ایک اور شعر میں بھی کہ۔

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

قیامت کے معنی اس تہلکے کے ہیں جو پہلے شعر میں مراد لیا گیا ہے پر آگے چل کر ایک اور شعر میں غالب نے اس کے معنی کو اور پھیلا دیا ہے وہ شعر یہ ہے۔

Scanned with CamScanner

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

یہاں اپنے پیارے سے بچھڑنے ہی کو قیامت کہا گیا ہے یہ خیال کچھ اس کہاوت سے ملتا ہے "آپ مرے تو جگ پرے" یعنی آدمی جس دن مرتا ہے وہی اس کے لیے قیامت کا دن ہے۔

حنا یا مہندی اپنے لال چمکیلے رنگ کے لیے مشہور ہے اور عورتوں کے سنگھار میں کام آتی ہے جس کی طرف بہت سے شاعروں نے اشارہ کیا ہے جیسے:

مل کے مہندی کبھی دریا میں نہایا نہ کرو
آگ پانی میں مری جان لگایا نہ کرو

یا جیسے غالب بھی کہتے ہیں۔

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
دل سے مٹا تری انگشت حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا

پر غالب نے مہندی کے بول کو واماندگی اور ٹھیراؤ کے معنی بھی دیے ہیں اور یوں اسے ایک علامت بنا دیا ہے جیسے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پاکتا باندھتے ہیں
اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

Scanned with CamScanner

اور یہ معنی انھوں نے اس عام چلن سے لیے ہیں کہ مہندی لگا کر آدمی چلنے پھرنے سے رُک جاتا ہے۔ لوگ روزمرہ کی بات چیت میں بھی کہہ اٹھتے ہیں کہ تم ہمارے یہاں کیوں نہیں آئے۔ کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی؟ انھیں معنوں میں ذوق کا ایک شعر ہے۔

یاد آیا یاں کے آنے کا وعدہ انھیں تو کب
جب رات کو وہ پاؤں میں مہندی لگا چکے

یا نظیر اکبرآبادی کہتے ہیں۔

شب کے خلاف وعدہ کا جب بن سکا نہ عذر
ناچار پھر تو ہنس دیا اور دی دکھا حنا

معشوق کی زلف کالی اور لمبی ہوتی ہے اور حُسن بڑھانے کے لیے اس میں چھلے بھی ڈالے جاتے ہیں جن میں عاشقوں کے دل اسی طرح پھنس کر رہ جاتے ہیں جیسے پاگل سانکل میں کس جاتا ہے۔ غالب کے ایسے ہی کچھ شعر نیچے لکھے جاتے ہیں جن میں معشوق کی زُلف کے یہ گن دکھائے گئے ہیں۔

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

تو اور آرائشِ خمِ کاکُل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویِ وارستگی کی شرم

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشان کیے ہوئے

زلف کے یہ سب کے سب گن عام ہیں اور ہر نئے پرانے شاعر کے یہاں ملتے ہیں پر

Scanned with CamScanner

غالب نے زلف کو ظلم کے ایک اور معنی دے کر ایک علامت بنا دیا ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔

ہو رہا ہے جہاں میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

ظاہر ہے کہ یہاں اندھیر کا بول اندھیرا سے لیا گیا ہے جس کے معنی تاریکی اور سیاہی کے ہیں۔

پاؤں کا ذکر لگ بھگ سبھی شاعروں کے یہاں ملتا ہے اور اپنے اصل معنی دیتا ہے پر غالب کے یہاں اس کا ذکر بہت زیادہ ہے اور رنگ رنگ سے آیا ہے۔ کبھی وہ معشوق کے پاؤں چومنے کی خواہش کرتے ہیں کبھی اس کے پاؤں دابنا چاہتے ہیں۔ کبھی اس کے پاؤں دھو کر پینے پر مچلے ہوئے ہیں اور کبھی اس کا نقشِ قدم دیکھ کر ہی لوٹ ہوئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مہندی لگے پاؤں بہت پسند تھے۔ وہ آپ ہی کہتے ہیں۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

پر جب غالب اپنے پاؤں کا بھی ذکر اسی کثرت سے کرتے ہیں جیسے۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن کے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

تو پھر ان کے یہاں پانوں خالی پانوں نہیں رہتے فرار کی علامت بن جاتے ہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

Scanned with CamScanner

مرزا کے یہاں خم کا ذکر بھی رنگ رنگ سے آیا ہے۔ انھیں یہ جھکاؤ شمشیر، کمان، قد، دست نوازش، آغوش، ماہ نو، مسجد، (محراب)، طوق، کشتی، کان اور دوسری بہت سی چیزوں میں جہاں کہیں بھی دکھائی دیتا ہے ان کا دل موہ لیتا ہے اور وہ مزے لے لے کر سے بیان کرتے ہیں جیسے۔

عشرت قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

اسد :: نی تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خم دست نوازش ہوگیا ہے طوق گردن میں

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کررہا ہے سلام

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

پران کے یہاں جو اصل تصویر اُبھرتی ہے وہ تیر اور کمان کے ملنے سے بنتی ہے جیسے:

جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوش وداع

آمدِ سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

پر پروانہ شاید بادبان کشتی مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

ابرو کو ہے کیا اس نگہہ ناز سے پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

Scanned with CamScanner

پہلے شعر میں ماہِ نو کو آغوش سے اور تارِ شعاع کو جادے سے تشبیہ دی ہے۔ دوسرے میں نقشِ پا کے کان میں جادے کی اُنگلی دکھائی ہے۔ تیسرے میں بادبان اور مستول سمیت کشتی پیش کی ہے اور چوتھے میں ابرو اور نگاہ کو تیر اور کماں بتایا ہے۔ اسی طرح ان کے کلام میں پنبہ اور روزن کا ذکر بھی طرح طرح سے آیا ہے جیسے۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دوں پنبہ دیواروں کے روزن میں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

اور یہ سب علامتیں جنسی لگتی ہیں اور جنسی انگوں سے اُبھری ہیں۔

غالب یہ مانتے تھے کہ انسان اس دنیا میں مٹی کا بے بس کھلونا ہے جو اپنے بنانے والے کے ہاتھوں ناچتا رہتا ہے۔ دنیا کے حالات اس کے بس سے باہر ہوتے ہیں جنھیں وہ اپنے مرضی کے مطابق ڈھال نہیں سکتا اس لیے آئے دن اس کے جی میں ایک نہ ایک خواہش دم توڑتی رہتی ہے اور آخر میں وہ حسرتوں کی ایک پوٹ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے شعروں کی تہ میں دکھ کی ایک لہر چلتی دکھائی دیتی ہے۔ سوچ کا یہ ڈھنگ انھوں نے تصوف سے لیا ہے جس سے ان کا گہرا لگاؤ شعروں اور چٹھیوں دونوں میں جھلکتا ہے ان کے ایسے ہی کچھ شعر سنیے۔

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

Scanned with CamScanner

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

پھر ان کا من بھی ان کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ اس کے ہاتھوں بھی تباہ ہو رہے ہیں اور یہ مرزا کی باہری اور بھیتری دونوں طرح کی بے بسی ہے جو ان کے دکھ کو آخری حدوں تک پہنچا دیتی ہے جیسے۔

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدُو ہے فراغ کا
کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

مرزا اسد دکھی من کی موجوں میں ہی نہیں بہتے۔ وہ اوپر اُٹھ کر بھی نظر ڈالتے ہیں اور بھاؤ میں سوچ ملا کر ایسا گمبھیر سماں پیدا کر دیتے ہیں کہ دکھ ہڈیوں میں اُتر کر جاودانی بن جاتا ہے اسی لیے مرزا کے یہاں دکھڑا رونے کا ڈھنگ کم اور دُکھ کو سمجھنے کی کوشش زیادہ ملتی ہے جیسے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

Scanned with CamScanner

غالب دنیا کو قید خانہ اور اپنے آپ کو قیدی سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنا گلا گھٹتا ہوا لگتا ہے اور وہ بار بار دل کی تنگی کا گلہ کرتے سنائی دیتے ہیں۔

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

تنگی دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب
تیر بھی سینہ بسمل سے پرافشاں نکلا

وہ اس تنگی اور گھٹن سے چھٹکارا پانے کی بار بار خواہش بھی کرتے ہیں کیوں کہ اس کا بوجھ ان کی برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ ان کے بہت سے شعروں میں یہ خواہش سر اٹھائے نظر آتی ہے کہ یہ دنیا کچھ اور وسیع ہوتی جس میں وہ آسانی سے سانس لیتے جیسے:

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہاں ہے
جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے کنج قفس
ازسر نو زندگی ہو گر رہا ہو چاہیے

اور گھر بھی ایسا لمبا چوڑا میدان ہوتا جس میں کوئی دیوار یا دروازہ نہ ہوتا جیسے۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

مانع صحرا نوردی ہائے لیلےٰ کون ہے
خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

پر جب غالب دُکھ سے آنکھیں چار نہیں کر سکتے تو فرار کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں جیسے۔

Scanned with CamScanner

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اور پھر جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے پاؤں ان کے فرار کی علامت بن جاتا ہے وہ آپ کہتے ہیں۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے
بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہوکر اسیر داہتے ہیں راہزن کے پانوں

یہی بات مرزا علاؤ الدین احمد خاں کے نام ایک خط میں بھی ملتی ہے۔ مرزا لکھتے ہیں" ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گناہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو رو بکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں بعد میں جیل خانہ میں سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔" (عود ہندی خط ۵۵) ایک اور خط میں مرزا علاؤ الدین

Scanned with CamScanner

احمد خاں کو لکھتے ہیں۔ ''نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔''

ان سب شعروں اور چٹھیوں سے مرزا کا فرار اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے پر اس کے ساتھ ساتھ فرار کی ایک اور صورت مرزا کے یہاں یہ بھی پائی جاتی ہے کہ ان کا سوچ دکھ بھاؤ سے مل کر من سمجھاوے پر اُتر آتا ہے۔ اور چونیں سہلانے میں ہی مزے لینے لگتا ہے۔ ان کے بہت سے شعروں میں نقصان کو فائدہ اور تکلیف کو آرام ثابت کرنے کی کوششیں صاف صاف بتا رہی ہیں کہ مرزا نہ دُکھ کا بوجھ سہار سکتے ہیں نہ اس سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں اس لیے اپنے ہی من کو سمجھانے پر اُتر آئے ہیں جیسے۔

گلہ ہے شوق کو بھی دل میں تنگی جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
فشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

Scanned with CamScanner

رنج نومیدی جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے سوچ کا دھارا سیلاب کی طرح ایک سیدھ میں لگا تار آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اس لیے ان کے یہاں قطعوں اور مسلسل غزلوں کی بہتات ہے۔ جب وہ کسی ایک مضمون کو ایک شعر میں نہیں کھپا سکتے تو دوسرے شعروں میں بھی اسے دہراتے چلے جاتے ہیں جس کی ایک صورت تو وہی ہوئی جو ابھی بیان کی جا چکی ہے اور دوسری صورت یہ ہوئی ہے کہ ایک ہی مضمون ان کے کتنے ہی الگ الگ شعروں میں دہرایا گیا ہے وہ ملتی جلتی یا الٹی علامتوں میں سوچتے اور شعر کی چاروں چولیں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے کبھی کبھی بناوٹ اُبھر آتی ہے اور شعر منطقی مغالطہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنی چھٹیوں میں ہی نہیں شعروں میں بھی دوسروں کو برابر جتاتے ہیں کہ ان کا راستہ سب سے الگ ہے اور وہ عام لوگوں کی ریت اپنانا اچھا نہیں سمجھتے پر ان کے شعروں میں جن سماجی ریتوں اور ڈھنگوں کی پرچھائیاں ملتی ہیں اور جو علامتیں پائی جاتی ہیں وہ ان کے اس دعوے کو جھٹلا رہی ہیں۔ ہاں ان کے شعروں میں جہاں جہاں بھاؤ اور سوچ گھل مل گئے ہیں من کی موجیں گمبھیر ہوگئی ہیں اور ان میں تلوار کی سی کاٹ آ گئی ہے۔ وہ انسان کو بے بس مانتے ہیں اس لیے ان کے سوچ پر دُکھ کا بادل چھا گیا ہے پر وہ دُکھ کا بوجھ اٹھانے سے گھبراتے بھی ہیں اور جب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ پاتے تو آنکھیں بند کر کے من سمجھاؤں سے اسے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

----☆☆☆----

Scanned with CamScanner